انجمن

ترقی اردو

ہند

قیمت پانچ روپیہ

Printed by Khaleel Sharafuddin at Q. Press, 29 Mohd. Ali Road, Bombay 3,
and published by Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (Hind), Aligarh.
Title printed by
Aziz Husain, at National Printers' Co., Aligarh.

باپو کے قدموں میں

مصنفہ

راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد

(صدر جمہوریہ ہند)

کا ترجمہ

مولوی ابرار حسین فاروقی

ناشر

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھہ

سنہ ۱۹۵۳ع

PRINTED AT Q PRESS
29 MOHAMMADALI ROAD BOMBAY 3

فہرست مضامین

باب	مضامین	صفحہ
دسواں	علی برادران کے ساتھ مہاتماجی کا دورہ	۲۲۷
گیارھواں	آم کے درخت کے نیچے عہد نامہ پر دستخط	۲۵۵
بارھواں	کونسلوںمیں داخلہ اور آپس کا اختلاف	۲۷۲
تیرھواں	کھادی کے کام میں ترقی، دھلی میں کانگریس کا خاص اجلاس	۲۹۰
چودھواں	سنہ ۱۹۲٤ع — مہاتماجی کی بیماری اور ان کا آپریشن	۲۹۸
پندرھواں	سنہ ۱۹۲٤ع — دیش بندھو داس کا انتقال اور پنڈت موتی لال جی کی صدارت	۳۲۲
سولھواں	سنہ ۱۹۲۸ع — نوآباد باتی مرتبہ یا پورنا سوراج	۳٤۷
سترھواں	میرا برما جانا اور وھاں بہاری کسان	۳۵۸
اٹھارھواں	نمک کے قانون کو توڑنا اور مہاتماجی کی «ڈانڈی» کو روانگی	۳۶۹
انیسواں	بہار میں نمک کے قانون کے خلاف ستیہ گرہ	۳۷۸
بیسواں	بہ‌پور (بھاگلپور) کی ستیہ گرہ	۳۹۹
اکیسواں	ضلع سارن (بہار) میں میری گرفتاری اور سزا	٤۱۳
بائیسواں	جیل کے قانون کے متعلق چند ضروری تجویزیں	٤۲۱
تیئیسواں	لندن کی گول میز کانفرنس اور «لارڈ ولنگڈن» کا رویہ	٤٤۵

باب	مضامین	صفحہ

پیش لفظ

یہ کتاب ایك مثال ھے اس مصیبت کی جو چھاپے خانوں کی بد انتظامی بے پرواھی اور بد معاملگی کی وجہ سے کتابوں کے شایع کرنے والوں اور لکھنے والوں پر نازل ھوا کرتی ھے.

نومبر سنہ ٥١ میں اس کتاب کی طباعت کا معاھدہ ایك پریس سے ھوا تھا اور معاھدے کی ایك شرط یہ تھی کہ تین ماہ کے اندر اس کتاب کی چھپائی مکمل ھو جائیگی. جب سینکڑوں خوشامدوں اور تقاضوں کے بعد بھی جنوری سنہ ٥٣ تك یہ پریس آدھی کتاب بھی نہ چھاپ سکا، تب میں نے کسی نہ کسی طرح مسودات اس سے واپس لئے، اور میں مشکور ھوں بمبئی کے «کیو» پریس اور محبی خلیل شرف الدین صاحب کا جنھوں نے میری خاطر بقیہ کتاب کے چھاپنے کی ذمہ داری قبول کی اور بہت توجہ اور محنت سے اس کتاب کو تیار کر دیا. اسطرح ٧ سو صفحات کی یہ کتاب ١٤ مہینوں کی بے انتہا پریشانی اور کوفت کے بعد شایع ھو سکی.

میں اپنا دکھڑا لے بیٹھا، ورنہ سب سے پہلے تو مجھے

صدر جمہوریہ محترم ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نیازمندانہ شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ موصوف نے مجھے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی. پھر مجھے اس کتاب کی ہندی اشاعت کے پبلشر شری اجنٹا پریس پٹنہ کا شکریہ بھی ادا کرنا ھے جنہوں نے اس بات کا لحاظ کر کے کہ انجمن ترقی اردو پبلک کی خدمت کرنے والا ادارہ ھے اور کوئی تجارتی ادارہ نہیں ھے، بغیر کسی معاوضہ کے اپنے حق اشاعت کو انجمن کی طرف منتقل کرنے کی اجازت دی.

ملک کے محترم اور محبوب رہنما «راجندر بابو» کے قلم سے اس زمانے کی داستان — جب پہلی دفعہ ہندستان آنے کے بعد مہاتما گاندھی خدمت خلق کے میدان میں آئے اور پہلی مرتبہ «راجندر بابو» انکے ساتھیوں کی صف میں نمایاں ہوئے — ہندستان کی آزادی کی تاریخ کا ایک بہت اہم جزو ھے. کسطرح مہاتما جی نے اپنے ساتھیوں کی اخلاقی تعمیر شروع کی اور کسطرح سول نافرمانی کا بیج اپنے وطن کی سر زمین پر ڈالا — یہ ایک بصیرت افروز کہانی ھے، جو بہت سیدھے سیدھے اور سادہ الفاظ میں بیان کی گئی ھے.

«باپو کے قدموں میں» جدید ہندستان کے انقلابی ادب کا

ایك قابل قدر نمونه هے اور میں سمجھتا هوں که انجمن ترقی اردو نے اسکو اردو رسم الخط میں منتقل کرکے اردو ادب میں ایك گرانقدر اضافه کیا هے.

میں نہایت ادب کے ساتھ محترم صدر جمهوریه ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں انجمن کا یه هدیه عقیدت پیش کرتا هوں.

۱۸ اگست سنه ۵۳ ع

علی گڈھه

محمد عبد الغفار

جنرل سکریٹری

انجمن ترقی اردو (هند)

دیباچہ

گنگا کی مقدس دھار حسب دستور چل رہی ہے۔ کچھ بزرگ اور عقیدتمند اپنی محبت اور پریم کی پیاس بجھانے کے لئے اس میں سے تھوڑا بہت پانی لے لیتے ہیں جس کا جتنا ظرف ہوتا ہے وہ اتنا ہی اس میں سے پانی لے سکتا ہے۔ کوئی ہردوار ہی کے پاس سے سیکڑوں کوس کی نہر نکال کر جنتا کی خدمت کے لئے کروڑوں بیگہ زمین کو سیراب کرتا ہے۔ کوئی بدنصیب اسی گنگا کے کنارے رہ کر اس کے فیض سے محروم رہتا ہے۔ چھوٹے موٹے لوگ اپنی طاقت کے موافق بڑے گھڑے یا چھوٹے لوٹے ہی میں اس متبرک پانی کو لے سکتے ہیں۔ لیکن گنگا ہے کہ بہتی

ھی چلی جا رھی ھے اور جہاں جہاں اس کی دھار پہونچتی جاتی ھے۔ وھاں کی زمین سیراب اور سرسبز ھوتی جاتی ھے۔ یہی صورت مہاتما گاندھی کی ھے کہ جس میں جتنی سکت اور چاہ تھی۔ اس نے اسی کے موافق اس گنگا روپ مہاتما سے فیض حاصل کر لیا۔ اگر مین اس فیض سے محروم رہا تو یہ میری بدنصیبی ھے۔ بہرحال ان معاملات کی جو کچھ بڑائی اور ہمت اپنی سمجھ میں آئی ان کو مینؔ نے یہاں بیان کرنے کوشش کی ھے۔

اس کی کتابت کا کام والمیکی چودھری نے بڑی محنت سے کیا۔ جس کے لئے میں ان کا شکر گذار ھوں۔

راجندر پرشاد

نئی دھلی

۲۴ جون ۱۹۵۰ع

پہلا باب

گاندھی جی کو دیکھنے کا مجھے پہلا موقع کلکتہ میں ملا، جبکہ وہ جنوبی افریقہ سے آ کر بڑی بڑی جگہوں کا دورہ کر رہے تھے۔ کلکتہ میں ان کے استقبال کیلئے ایک جلسہ ہوا تھا، جس میں میں بھی تماشائی کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس زمانہ میں لوگ انکو «کرم ویر گاندھی» کہا کرتے تھے۔ سفید بند والی اچکن، دھوتی اور سفید کاٹھیاواڑی پگڑی، ان کا لباس تھا، کندھے پر ایک چادر ہوتی تھی اور ننگے پیر رہتے تھے۔ میں نے اخباروں میں ان کے جنوبی افریقہ کے کچھ قصے پڑھے تھے۔ اسلئے جب انکا استقبالی جلسہ ہوا تو میں بھی وہاں گیا۔ یہ شاید سنۂ ١٩١٥ کی بات ہے۔ جلسہ میں میں نے انکو دور سے ھی دیکھا۔ مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ جلسہ میں انہوں نے کیا کہا یہاں تک کہ یہ بھی

یاد نہیں کہ انہوں نے کچھ کہا بھی تھا یا نہیں کیونکہ بعد میں میں نے سنا کہ مرحوم گوکھلے جی نے ان سے وعدہ لے لیا تھا کہ ہندوستان کی حالت تو وہ جا کر دیکھیں لیکن ایک سال تک وہ کسی تحریک مین نہ تو حصہ لیں اور نہ کوئی بیان دیں۔ چونکہ یہ جلسہ اس ایک سال کے اندر ہی ہوا تھا۔ اسلئے انہوں نے شاید اسمیں کچھ نہیں کہا تھا۔ بہرحال آج مجھے کچھ یاد نہیں ہے، ہاں اتنا یاد ہے کہ اسوقت میں کلکتہ میں ہی رہتا تھا اور اس جلسہ میں گیا تھا۔

دسمبر سنہ ۱۹۱۶ میں لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ میں پٹنہ ہائی کورٹ کے کھلنے پر مارچ سنہ ۱۹۱۶ سے پٹنہ چلا آیا تھا اور وہیں وکالت کرنے لگا تھا۔ وہیں سے میں لکھنؤ کانگرس میں گیا۔ وہاں مہاتما جی بھی آئے تھے اور چمپارن کے کسانوں کے کچھ نیتا (لیڈر) بھی جن میں بڑے راجکمار شکل اور پیر محمد مونس تھے، جو کانگرس میں اپنا دکھڑا سنانے گئے تھے۔ مین وکالت کی وجہ سے راجکمار شکل کو جانتا تھا اور چمپارن کے کسانوں کی بری حالت سے بھی کچھ واقف تھا، لیکن وہ واقفیت بہت ھی ناقص

اور ادھوری تھی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ نہیں کے برابر تھی تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا. بہار کے نوجوانوں کے نیتا مرحوم برجکشور پرشاد جی تھے وہ وھاں کی شکایتوں سے کافی واقف تھے. کیونکہ اس زمانہ کی "لیجسلیٹیو کونسل" کے وہ ممبر تھے جہاں انہوں نے اس معاملے مین کئی بار سوالات کئے تھے. اس کے علاوہ دوسرے طریقہ سے بھی اس بات کا چرچا کونسل میں کیا تھا. شری راجکمار شکل پہلے مہاتما گاندھی سے ملے اور انکو چمپارن کا دکھڑا سنایا بابو برجکشور پرشاد جی بھی شاید ان لوگوں کے ساتھ گاندھی جی سے ملے. اور سب نے گاندھی جی پر زور دیا کہ وہ چمپارن کے متعلق کانگرس میں ایک ریزولیوشن خود پیش کر کے منظور کرائیں تو بہت اچھا ہو لیکن گاندھی جی نے ریزولیوشن پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا. انکا کہنا تھا کہ جب تک میں خود دیکھکر ان باتوں کو اچھی طرح نہ جانچ لوں اسوقت تک مین ریزولیوشن پیش نہیں کر سکتا. ھاں، میں اس کے لئے چمپارن جا کر خود دیکھونگا کہ جو کچھ تم لوگ کہتے ھو وہ کہانتک ٹھیک ھے. چنانچہ یہ تجویز بابو

برجکشور نے پیش کی اور شری راجکمار شکل نے تائید
کی اور وہ تجویز کمیٹی میں اتفاق رائے سے پاس ہوگئی۔
یہ شاید پہلا ہی موقع تھا کہ ایک دیہاتی ان پڑھ کسان
کانگرس کے پلیٹ فارم سے کسی ریزولیوشن کی تائید میں
بولا ہو۔ لکھنؤ میں گاندھی جی سے ملاقات کا یہ پہلا موقع
تھا لیکن پھر بھی اس کو صحیح معنوں میں ملاقات نہیں
کہا جا سکتا۔

کانگریس کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔
لیکن راجکمار شکل نے گاندھی جی سے یہ وعدہ لے لیا
تھا کہ جب کبھی وہ بہار کی طرف سے گذریں گے تو
چمپارن بھی جائیں گے اور وہاں کی حالت دیکھیں گے۔ مارچ
سنہ ۱۹۱۷ میں گاندھی جی کو ایکبار کلکتہ جانا پڑا، چنانچہ
انہوں نے راجکمار شکل کو خط لکھا کہ وہ ان سے کلکتہ
میں ملیں اور وہاں سے وہ ان کو چمپارن لیجائیں۔ لیکن
بد قسمتی سے وہ خط راجکمار شکل کو اس وقت ملا جبکہ
گاندھی جی کلکتہ سے واپس چلے جا چکے تھے۔ بہار کے
دیہاتوں میں ڈاکیہ (چٹھی رساں) ہفتہ میں ایک یا دو بار سے

زیادہ ڈاک لیکر نہیں جاتا. راجکمار شکل ضلع چمپارن کے رھنے والے تھے، جو ایک چھوٹا ضلع سمجھا جاتا اور اس کے بھی اس حصہ میں وہ رہتے تھے جو سب سے زیادہ دور افتادہ ھے. اس لئے اس خط کا وقت پر نہ ملنا کچھ اچنبھے کی بات نہ تھی.

اپریل سنہ ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ایسٹر کی چھٹیوں میں کلکتہ میں ھونیوالا تھا. گاندھی جی اسمیں شریک ھونے کے لئے کلکتہ گئے، جس کی اطلاع انہوں نے راجکمار شکل کو دے دی. وہ اس دفعہ خط کے وقت پر مل جانے سے کلکتہ پہنچ گئے. اور شری بھوپندر ناتھ باسو کے مکان پر، جہاں گاندھی جی ٹھہرے ھوئے تھے. جا کر ان سے ملے. میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر تھا، اور اس جلسہ میں شریک تھا. اتفاق سے جلسہ میں میں گاندھی جی کے بہت نزدیک ھی بیٹھا تھا. لیکن وہ مجھے نہیں جانتے تھے اور نہ میں یہ جانتا تھا کہ وہ کلکتہ سے ھی سیدھے بہار جانے والے ھیں. راجکمار شکل ان کے ساتھ جلسہ تک تو گئے لیکن باھر ھی ٹھہر گئے اس لئے

میری ملاقات ان سے بھی نہیں ہوئی. جلسہ ختم ہونے پر میں «جگناتھ پوری» چلا گیا، اور ادھر گاندھی جی راجکمار شکل کے ساتھ پٹنہ چلے آئے. ایک دوسرے سے جان پہچان نہونیکی وجہ سے، پاس بیٹھے رہنے پر بھی، ہم ایک دوسرے کے پروگرام کو نہ جان سکے ورنہ میں شاید ان کے ساتھ ہی بہار چلا جاتا. ادھر میں «پوری» پہونچا اور ادھر گاندھی جی میرے گھر پٹنہ پہنچے.

میں کلکتہ میں وکالت کیا کرتا تھا. مگر جب مارچ سنۂ ۱۹۱۶ میں بہار کے لئے پٹنہ میں الگ ہائی کورٹ کھلا تو میں پٹنہ چلا آیا اور وہیں وکالت کرنے لگا. کرایہ کے مکان میں رہتا تھا. گھر کے لوگ ساتھ نہیں رہتے تھے. وہ لوگ بھائی کے ساتھ چھپرا یا موضع «جیروائی» میں رہا کرتے تھے، اس لئے پٹنہ میں نوکر ہی ساتھ رہا کرتے تھے. کلکتہ بہار سے بہت دور پڑتا تھا. اور بہاریوں کیلئے وہ ایک اجنبی جگہ تھی. اس لئے جب کوئی معمولی آدمی وہاں ہائی کورٹ میں مقدمہ کے لئے جاتا. تو وہ زیادہ تر کسی وکیل یا مختار کے پاس ٹھہرتا. ایک تو کوئی دوسری

جگہ اس کو ایسی نہین ملتی جہاں وہ ٹہر سکتا، اور دوسرے اس زمانہ میں نہ تو ہوٹلوں کا اتنا رواج تھا اور نہ بہار کے گاؤں کا رھنیوالا کوئی آدمی ہوٹل میں رھکر وہاں کھانا پسند کرتا اس لئے ہماری وکیلوں کا گھر موکلوں کے لئے تو دھرم شالہ جیسا تھا، کوئی کوئی وکیل تو موکلوں سے کھانے کے دام بھی لے لیتے تھے مگر مین ایسا نہین کرتا تھا، جو کوئی میرے یہاں ٹہر جاتا تھا اس کو مین بغیر دام لئے ہی اپنے گھر پر ٹہراتا اور کھانا کھلاتا تھا. ہم لوگ جب کلکتہ سے پٹنہ آئے تو یہ دستور بھی اپنے ساتھ لیتے آئے، اس لئے پٹنہ مین بھی کبھی کبھی موکل آ کر ہمارے گھر پر ٹہر جایا کرتے تھے. ان کے لئے ایک کمرہ بھی مخصوص کر رکھا تھا. نوکر لوگ بھی جان گئے تھے کہ موکلوں کو کہاں ٹہرانا چاہئے. اور ان کیساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے جب مین آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ مین شریک ہونے کیلئے کلکتہ گیا تھا، اور وہاں سے «پوری» چلا گیا، تو پٹنہ کے وہ نوکر جو میرے ساتھ نہین گئے تھے، چھٹی مین اپنے اپنے گھر چلے گئے

تھی، صرف ایک نوکر، جو نرا دیہاتی تھا، مکان کی دیکھ بھال کے لئے رہ گیا تھا.

پٹنہ میں پہنچ کر راجکمار شکل گاندھی جی کو میرے گھر لے گئے. کیونکہ وہ کسی اور کو نہیں جانتے تھے. جن کے یہاں وہ گاندھی جی کو ٹھہراتے، میں، بد نصیب وہاں موجود نہ تھا، نوکر نے گاندھی جی کو ایک دیہاتی موکل سمجھ لیا، اسمیں اس بیچارے کا کوئی قصور نہ تھا. کیونکہ راجکمار شکل تو دیہاتی موکل تھے ھی، دیہاتی بولی میں اور رہنے سہنے میں بھی وہ چمپارن ھی کے تھے. گاندھی جی کی وضع قطع بھی کچھ ویسی ھی تھی. میں نے اوپر لکھا ھے کہ جلسہ وغیرہ میں گاندھی جی، دھوتی، اچکن کاٹھیاواڑی پگڑی استعمال کیا کرتے تھے. اسی وضع میں میں نے ان کو کلکتہ کے استقبالی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں دیکھا تھا، لیکن عام طور سے وہ دھوتی، کرتا اور دیسی ٹوپی پہنا کرتے تھے. جو بعد میں "گاندھی ٹوپی" کے نام سے مشہور ھوئی. اس قطع کی ٹوپی بہار اور یو پی (صوبہ متحدہ) میں بہت سے لوگ پہنا کرتے تھے.

مگر «گاندھی ٹوپی» اور ان ٹوپیوں میں بڑا فرق یہ تھا کہ «گاندھی ٹوپی» ہمیشہ کھادی کی ہوا کرتی تھی، «گاندھی جی» کی وضع قطع سے یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کوئی بڑے آدمی ہیں. اس لئے اس نے ان کو موکل ہی کیطرح ٹھرایا اور ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا، یہاں تک کہ اس پاخانے کو بھی نہیں استعمال کرنے دیا، جو خاص گھر کے مالک کے استعمال مین رہا کرتا تھا. گاندھی جی نے روزانہ کے معمول کے موافق غسل بھی نہیں کیا اور سوچ ہی رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے کہ اتنے میں مظہرالحق صاحب کو خبر لگی کہ گاندھی جی پٹنہ آئے ہوئے ہیں اور میرے ہاں ٹہرے ہیں. مظہرالحق صاحب گاندھی جی کے دکھنی افریقہ کے کاموں سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو بہت پہلے سے بھی جانتے تھے کیونکہ بیرسٹری پاس کر کے دونوں ایک ہی جہاز میں لوٹے تھے، گاندھی جی کو میرے مکان سے اپنے گھر لے گئے اور ان کو انھوں نے اپنے ساتھ ٹہرایا. گاندھی جی چمپارن پہونچنے کے لئے بے چین تھے، لیکن شام سے پہلے

وھاں کے لئے کوئی گاڑی نہیں تھی، اس لئے شام ھی کی گاڑی سے جانے کا فیصلہ کر کے وہ روانہ ھو گئے. مظفر پور راستہ میں پڑتا ھے، جہاں ترھٹ ڈویژن کا کمشنر رھتا تھا، نیل والوں کی انجمن بنام «بہار پلانٹر ایسوسی ایشن» کا دفتر بھی وھیں تھا اور اس کا صدر بھی وھیں رھا کرتا تھا اس لئے انہوں نے یہ سوچ کر کہ چمپارن پہنچنے سے پہلے ان لوگوں سے مل لینا اچھا ھوگا، مظفر پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا.

جو تجربہ انکو پٹنہ میں میرے گھر پر ٹھہرنے میں ھوا تھا اسکی وجہ سے انہوں نے راجکمار شکل پر اپنے ٹھہرنے ٹھہرانے کا بوجھ نہ ڈالا بلکہ انہوں نے خود ھی اس کا بندوبست کر لیا. اچاریہ کرپلانی اس زمانے میں مظفر پور میں پروفیسر تھے. گاندھی جی سے ان کی ملاقات تو نہیں تھی، لیکن ان سے خط و کتابت رھتی تھی اس لئے گاندھی جی ان کو جانتے تھے. چنانچہ پٹنہ سے چلتے وقت انہوں نے کرپلانی جی کو تار دے دیا تھا. کرپلانی جی چند شاگردوں کے ساتھ اسٹیشن پر ان سے ملنے آئے. گاڑی

وہاں آدھی رات کے وقت پہنچتی تھی۔ کرپلانی جی بھی گاندھی جی کے رہن سہن سے کچھ زیادہ واقف نہ تھے اس لئے سب لوگ اسٹیشن پر ان کو اونچے درجے کے ڈبے میں تلاش کرنے لگے۔ گاندھی جی اس وقت تک اپنی چھوٹی گٹھری لئے ہوئے۔ راجکمار شکل کے ساتھ تیسرے درجہ کے ڈبہ سے اتر کر پلیٹ فارم سے باہر جانیکے لئے پھاٹک کیطرف جارہے تھے جب کرپلانی جی اور ان کے ساتھیوں کو گاندھی جی اونچے درجہ میں نہ ملے تو وہ لوگ پلیٹ فارم پر ان کی تلاش مین دوڑ دھوپ کرنے لگے، راجکمار شکل ان کی دوڑ دھوپ سے سمجھ گئے۔ کہ یہ لوگ گاندھی جی کی تلاش مین ہیں، چنانچہ ان میں سے ایک سے انھوں نے پوچھا کہ آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں۔ شکل جی کو نرا دیہاتی سمجھ کر کسی نے جواب تک نہ دیا اس وقت راجکمار شکل نے خود ہی کہا «کیا آپ لوگ کرم ویر گاندھی جی کو تلاش کر رہے ہیں؟ وہ میرے ساتھ یہ ہیں» یہ بات سن کر سب لوگ جمع ہو گئے۔ گاندھی جی دھوتی۔ کرتا اور ٹوپی پہنے

ہوئے تھے، بغل میں ایک چھوٹی گٹھری تھی، جس میں بچھانے کے لئے بستر وغیرہ اور پہننے کے کپڑے تھے، جس سے سوتے وقت تکیہ کا کام بھی لے لیا کرتے تھے۔ دوسرے ہاتھ میں ایک ٹین کا ڈبہ تھا۔ جس میں کھانے کے لئے کھجوریں اور مونگ پھلیاں تھیں۔ راجکمار شکل اپنا سامان اور لوٹا اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔

گاندھی جی سے مل کر سب بہت خوش ہوئے، کرپلانی جی جو کالج کے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ گاندھی جی کو اپنے ساتھ ہوسٹل میں لے گئے اور انہوں نے ان کو وہیں ٹھہرایا۔ اگرچہ یہ پورا گورنمنٹ کالج نہیں تھا لیکن چونکہ اس کو گورنمنٹ سے کافی امداد ملا کرتی تھی اس لئے اس پر گورنمنٹ کا پورا پورا اختیار تھا، کہ کالج کا پرنسپل اس زمانہ میں کوئی نہ کوئی انگریز جو آئی۔سی۔ایس (ایجوکیشنل سروس) کا ہی ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ مجھکو یاد نہیں کہ اس وقت کون پرنسپل تھا۔ کرپلانی جی نے گاندھی جی کو اپنے ہاں ہوسٹل میں ٹھہرا تو لیا لیکن وہ ان کو وہاں رکھ نہ سکے۔ چنانچہ دوسرے دن گاندھی جی

ایک وکیل کے گھر جا کر ٹہر گئے، تھوڑے ھی دنوں میں اس قصور پر کرپلانی جی کو نوکری سے استعفاء دینا پڑا، اور وہاں سے چھٹی پا کر گاندھی جی کے ساتھ چمپارن میں کام کرنے لگے۔

گاندھی جی کمشنر اور نیل والوں کی «انجمن» کے صدر سے ملے۔ اور ان کو اپنا مقصد بتایا۔ ان لوگوں نے گاندھی جی کو چمپارن جانے سے منع کرتے ہوئے کہا کہ «رعایا کی شکایتوں کی جانچ گورنمنٹ کرا رھی ھے، چمپارن میں «سروے سٹلمنٹ» کے افسر کام کر رھے ھیں اس لئے جو کچھ بھی شکایت ھوگی اس پر غور کر کے گورنمنٹ مناسب کارروائی کرے گی، آپ کے جانے سے رعایا بھڑکے گی۔ اس طرح سے لڑائی کے زمانہ میں گڑبڑ ھو سکتی ھے جو کسی طرح مناسب نہیں ھے» اس وقت جرمنی کا فرانس پر دھاوا ھوا تھا۔ اور بہت شدت سے لڑائی ھورھی تھی ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ «بہت سے نیل والے لڑائی پر چلے گئے ھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں کسی بڑی تحریک کا اٹھانا ٹھیک نہیں ھوگا» اس طرح کی باتیں کہکر گاندھی جی

کو وہاں جانے سے روکا اور رعایا کی شکایتوں کو مبالغہ آمیز اور غلط بتایا، گاندھی جی نے تار دیکر بابو برجکشور پرشاد کو دربھنگہ سے بلا لیا تھا، کیونکہ وہی اس معاملے کو اچھی طرح جانتے تھے، گاندھی جی کہتے تھے کہ " جس قدر وہ لوگ روکنے میں زور دیتے تھے اسی قدر ان کے دل میں شک بڑھتا اور خیال مضبوط ہوتا جاتا تھا، کہ کچھ دال میں کالا ضرور ھے، انہوں نے آخر مین دو تین ملاقاتوں کے بعد چمپارن جانیکا ارادہ کر ھی لیا۔

اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چمپارن کی بہت سی رعایا یہ سن کر کہ گاندھی جی انکی مدد کیلئے مظفر پور تک آ گئے ھیں چمپارن سے ان کے پاس چلے آئے، اور ان لوگوں نے اپنا اپنا دکھڑا ان کو سنایا جس سے راجکمار شکل کی کہی ہوئی باتونکی تصدیق ہو گئی، چمپارن کی رعایا اتنے عرصہ تک ظلم سہتے سہتے ڈرپوک بھی ھو گئی تھی، جسکی وجہ سے نیل والوں کے خلاف کچھ کہنے کی ھمت نہیں پڑتی تھی، نیل والوں کا گورنمنٹ کے افسروں پر بہت اثر تھا، کیونکہ ان کے دوست اور مددگار مقامی حکام

سے لیکر ولایت تک میں تھے، ان کے مظالم کی خبریں مقامی حکام تک پہنچتی رہتی تھیں، لیکن وہ بھی کسانوں کی کوئی خاص مدد نہیں کر سکتے تھے اور جب معاملہ بگڑ جاتا تو گورنمنٹ بھی کچھ نام نہاد کارروائی کر دیا کرتی، جس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا تھا، کبھی کبھی رعایا بھی بگڑ کر بلوہ اور فساد کرنے لگتی تھی. نیل والوں میں سے دو ایک کو انہوں نے مار بھی ڈالا اور انکی دو ایک کوٹھیوں کو جلا بھی دیا، لیکن اس قسم کے بلوہ اور فساد کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اور بھی پیسے جاتے، کچہریوں کے ذریعہ سے پھانسی اور قید کی سزا کے علاوہ دوسرے قسم کی سزائیں بھی انہیں ملتیں. ان کے گھر اور کھیت لوٹ لئے جاتے، مویشی وغیرہ بھگا دئے جاتے، گھروں میں آگ لگا دی جاتی، وہ خود بھی پیٹے جاتے اور ساتھ ھی انکی بہو بیٹیوں کی عزت بھی برباد کی جاتی. فساد کے بعد «نیل والے» اور سرکاری کارکن ان کو اتنا دباتے کہ بہت دنوں تک تو ضلع بھر میں موت کا سا سناٹا چھایا رہتا. جس علاقہ میں فساد ہوتا. وہاں تعزیری پولس بٹھا

دی جاتی، جہاں اس کا یہ کام تھا کہ کسانوں کو خوب لوٹے اور کھسوٹے، اس کے علاوہ پورا خرچ بھی گورنمنٹ رعایا سے وصول کرتی۔ دو ایک بار گورنمنٹ نے جانچ کرنے کیلئے خاص افسروں کو بھیجا، ان کی رپورٹ کسی حد تک ان کے موافق ہوئی لیکن کونسل میں بہت چرچا ہونے کے باوجود وہ شائع نہیں کی گئی، کسان اتنے ڈر گئے تھے کہ کسی نیل والے یا اس کے ملازم کے خلاف کسی قسم کی شکایت لیکر کسی عدالت و کچہری میں نہیں جاتے تھے، جب انکی شکایتیں کونسل میں پیش کی جاتیں تو گورنمنٹ کا جواب یہی ہوتا کہ کسانوں کو اگر موٹی شکایت ہوتی تو وہ خود ہی عدالت میں پیش کرتے، چونکہ وہ لوگ ایسا نہیں کرتے ہیں، اس لئے یہ تو کچھ باہر ہی کے شورشی لوگونکی شرارت ہے جو « نیل والوں » کی شکایت کرتے ہیں، یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر کسانوں میں سے کسی نے ہمت کر کے نالش کر بھی دی، تو « نیل والوں » کے جو آدمی وہاں لگے رہتے تھے، وہ اس کو مجسٹریٹ کے سامنے ہی اجلاس سے گھسیٹ کر باہر

لاتے اور اس کو خوب پیٹتے ۔ اس لئے شکایتوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ لوگ ڈر کی وجہ سے کچہری تک نہیں پہنچ پاتے تھے ۔

گاندھی جی کے دو چار آدمیوں کے سوا ، جنھوں نے یا تو کہیں کچھ سن لیا تھا ۔ اور یا اخباروں میں پڑھ لیا تھا ، کسانوں میں سے شاید ہی کوئی کچھ جانتا ہوگا ۔ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ مجھ جیسا ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا اور پبلک مسئلوں مین کچھ دلچسپی رکھنے والا آدمی بھی ان کے بارے میں بہت تھوڑا ھی جانتا تھا ۔ تو بیچارے محض جاھل کسانوں کو کیا معلوم ہوتا ۔ جو چمپارن جیسے پست ضلع کے گاؤں کے رھنے والے اور نیل والوں کے ستائے ہوئے خوفزدہ تھے لیکن انھوں نے اتنا سن لیا تھا کہ انکی مدد کرنیوالا کوئی مظفر پور تک آ گیا ھے اور نہ معلوم ان کے دل میں یہ خیال کیسے جم گیا تھا کہ وہ آدمی ان کا ھمدرد بھی ھے ۔ نہ معلوم وہ ڈر جو ھمیشہ ان کو ستایا کرتا تھا ، کہاں چلا گیا اور ان میں سے سیکڑوں مظفر پور آ کر گاندھی جی سے ملے ۔

گاندھی جی نے چمپارن جانیکا ارادہ کر ھی لیا، یہانتک کہ تاریخ اور وقت بھی طے ھو گیا، موتی ھاری نے مشہور وکیل بابو گورکھ پرشاد جو کسانونکی کچھ مدد کیا کرتے تھے، مظفر پور آ گئے. انھوں نے اپنے گھر پر ٹھرنے کیلئے گاندھی جی کو دعوت دی، گاندھی جی کیلئے دشواری یہ تھی کہ وہ وھاں کی دیہاتی بھوجپوری بولی نہیں سمجھ سکتے تھے، اگرچہ وہ کچھ ھندی جانتے تھے لیکن وہ بھی اتنی نہیں کہ وہ اس سے اپنا سب کام نکال سکیں، کسان بھی ٹھیک طرح سے اپنی بولی کے سوا دوسری بولی خاص کر گاندھی جی کی. نہیں سمجھ سکتے تھے اس لئے ایسے آدمیونکی ضرورت تھی، جو ترجمانی کا کام کر سکیں، بابو برج پرشاد جنکی وکالت بہت بڑھی چڑھی تھی، اس وقت کسی خاص مقدمہ کی وجہ سے دو چار روز تک گاندھی جی کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھی. اس لئے وہ اپنے ایک دوست "بابو دھرنی دھر" کو جنکی وکالت بھی اچھی چمک گئی تھی اور بابو رام نومی پرشاد کو جو ابھی نوجوان تھے اور تھوڑے ھی دنوں سے وکالت کر رھے تھے

ترجمانی کیلئے گاندھی جی کے ساتھ کر کے خود اپنے کام سے کلکتہ چلے گئے.

مظفر پور میں دو ھی تین دن گاندھی جی ٹھرے اور اسی درمیان میں یہ سب باتیں ھوئیں، اس کیساتھ ھی انھوں نے آس پاس کے گاؤں کی حالت بھی دیکھنی چاھی چنانچہ مظفر پور کے کچھ دور کے کئی مواضعات کو جا کر دیکھا بھی، بہار ایک غریب صوبہ ھے. زمین اگرچہ بہت زرخیز ھے لیکن پھر بھی مفلسی بہت ھے. خاص کر اتری بہار میں جہاں آبادی بھی بہت ھے. گاندھی جی کو دیہات کی ابتری اور گندگی دیکھکر بہت تکلیف ھوئی. اور غریب عورتونکی حالت کو دیکھہ کر تو بہت ھی دکھہ ھوا انھوں نے فوراً ھی اپنے ساتھہ والوں سے کہا کہ جب تک ان غریب گانوں والوں اور ان گانووں کی حالت نہیں سدھرے گی اس وقت تک ھندوستان کا بھلا کیسے ھو سکتا ھے. ان دو تین دنوں ھی میں گاندھی جی کی بات چیت سن کر اور ان کو کام کرتے ھوئے دیکھہ کر بہتیرے لوگ دنگ رہ گئے. گاندھی جی چمپارن ضلع کے صدر مقام

موتی هاری پہنچے تو وہاں سیکڑوں کسان ان کے استقبال کیلئے ریلوے اسٹیشن پر آ گئے. گورکھ بابو کے گھر پر ان کے پہنچتے ہی لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور وہ اپنی اپنی آپ بیتی سنانے لگے. گاندھی جی پر ان باتوں کا اثر ضرور ہو رہا تھا لیکن پھر بھی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ نہ دیکھ لیتے اس وقت تک ان کو پورا یقین نہ ہوتا. اتفاق سے ان کے پہنچنے سے دو ہی چار روز پہلے ایک عزت دار کسان کو ایک نیل والے نے بہت ستایا تھا. وہ شخص سیکڑوں بیگھہ زمیں جوتتا تھا اور اتنا دھنی اور مالدار تھا کہ اس کے دروازے پر ہاتھی بندھا رہتا تھا، جو بہت دھنی اور عزت والے ہی رکھ سکتے تھے. نیل والوں نے پولس کی مدد سے اس کے گھر کو لٹوا لیا تھا، اس کے کھیت کی کھڑی فصل کو مویشیوں سے چروا دیا تھا، اس کے باغ کے درختوں خاص کر کیلے کے درختوں کو ہاتھیوں سے روندوا دیا تھا اور اس کے کھپریلوں کو، چھپروں کو لاٹھیوں سے توڑوا کر چور چور کرا دیا تھا، کسی وجہ سے ناخوش ہو کر یہ برتاؤ کیا گیا تھا.

اس لوٹ کھسوٹ کے سب نشانات جوں کے توں موجود تھے۔ اس نے گاندھی جی کے پاس آ کر اپنی رام کہانی سنائی۔ گاندھی جی نے ارادہ ظاہر کیا کہ اس لوٹ کھسوٹ کے نشانات وہ خود جا کر دیکھیں گے۔ لہذا سواری کے لئے اس نے اپنا ہاتھی بھی لا کر پیش کیا، موتی ہاری پہنچنے کے بعد چند گھنٹوں کے اندر ہی یہ فیصلہ ہو گیا تھا، لہذا دوسرے ہی دن نو دس بجے گاندھی جی اپریل کی دوپہر کی دھوپ کی پروا نہ کرتے ہوئے اس گاؤں کے لئے جو وہاں سے دس گیارہ میل تھا، روانہ ہو گئے۔

ادھر گاندھی جی کی وجہ سے سرکاری حلقوں میں ہل چل مچی ہوئی تھی اور مظفر پور کے کمشنر نے چمپارن کے ضلع مجسٹریٹ کو حکم بھیج دیا تھا کہ گاندھی جی کو چمپارن سے چلے جانے کا حکم دے دے۔ ضلع مجسٹریٹ نے یہ حکم پاتے ہی ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۴۴ کے موافق گاندھی جی کو حکم دیا کہ «آپ چمپارن سے پہلی گاڑی سے چلے جائیے» یہ حکم گاندھی جی کو موتی ہاری سے گاؤں کیلئے روانہ ہونے تک نہیں ملا کیونکہ وہ بابو دھرنی دھر

اور بابو رام نومی پرشاد کیساتھ روانہ ہوچکے تھے. ان کے پیچھے پیچھے پولس سب انسپکٹر ضلع مجسٹریٹ کا ایک خط لیکر کچھ میل دور گاندھی جی سے ملا اور اس نے ان سے کہا کہ « ضلع مجسٹریٹ آپ سے ملنا چاھتے ھیں » گاندھی جی اس پولس افسر کیساتھ اسی سواری پر مجسٹریٹ سے ملنے کیلئے روانہ ھوگئے لیکن انہوں نے اپنے ساتھیوں کو یہ ھدایت کی کہ وہ سب لوگ گاؤں تک جا کر وھاں کا سب حال دیکھیں اور شام یا رات تک واپس آجائیں، موتی ھاری لوٹنے پر پہلے مجسٹریٹ نے ان سے واپس جانے کیلئے کہا لیکن جب انہوں نے اسکی یہ بات نہ مانی تو اس باضابطہ حکم دے دیا، گاندھی جی نے بھی اسی طرح سے جواب دے دیا کہ « وہ حکم نہ مانینگے مجسٹریٹ جو چاھے کرلے » اس پر مجسٹریٹ نے کہا کہ « عدول حکمی کا مقدمہ آپ پر چلایا جائیگا » اور ساتھ ھی یہ بھی ھدایت کی کہ « جب تک باضابطہ کارروائی نہ ھو اس وقت تک آپ دیہاتوں میں نہ جائیں » گاندھی جی نے اس حکم کو مان لیا اور باضابطہ کارروائی کا انتظار

کرنے لگے اس کے لئے بہت دنوں تک نہ ٹھرنا پڑا کیونکہ اسی دن «سمن» آیا اس کے دوسرے ھی دن مقدمہ کی پیشی مقرر تھی.

گاندھی جی نے اس رات بہت محنت کی، سب سے پہلے انہوں نے تمام دوستون اور مددگاروں کو تار کے ذریعہ سے مقدمہ کی خبر دی، میرے نام بھی ایک تار پہونچا جس میں لکھا تھا کہ «مجسٹریٹ نے مجھے چمپارن چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا ھے میں نے اسکی تعمیل نہیں کی اسلئے اب مقدمہ چلنے والا ھے، جس کا انتظار کر رھا ھوں، ایک تار انہوں نے اپنے جنوبی افریقہ کے ساتھی اور دوست «مسٹر پولک» کے نام پریاگ (الہ‌آباد) بھیجا، جہاں وہ ٹھرے ھوئے تھے. اس زمانے میں لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے تھے، گاندھی جی سے سمندر پار ھندوستانیوں کے مسئلوں کے متعلق ان سے اچھی ملاقات تھی، مہاتما جی نے ان کے نام ایک خط بھیجا جس میں تمام واقعات کے ساتھ برٹش گورنمنٹ سے اپنا پرانا تعلق بھی بتایا اور آخر میں یہ لکھا کہ «اسی گورنمنٹ نے ان

کو پبلک خدمات کے صلہ میں سونے کا " قیصرِ ہند " تمغہ دیا ہے ، جس کی وہ کافی قدر کرتے ہیں ، مگر جبکہ گورنمنٹ کا ان پر بھروسہ نہیں رہا اور وہ ان کو رعایا کی خدمت کرنے دینا نہیں چاہتی تو یہ ان کے لئے ناموزوں ہے کہ وہ اس تمغہ کو رکھیں اور اسلئے انہوں نے جن لوگوں کے پاس وہ تمغہ رکھا ہے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ وہ اس کو آپ کے پاس واپس کر دیں " انہوں نے تار کے علاوہ بہت سے دوستوں کے پاس خطوط بھی لکھے جس میں اس وقت تک کا پورا تفصیلی حال لکھ بھیجا ، اس کے علاوہ اس مقدمہ کی پیشی کیلئے اپنا ایک بیان تیار کیا ، جس کو انہوں نے دوسرے دن پیشی کے وقت پڑھا .

یہ سب کرتے ہوئے رات کا بڑا حصہ گذر گیا . ان تاروں ، خطوں اور بیان کو صرف لکھا ہی نہیں . تقریباً سب کی نقلیں بھی کر کے اپنے پاس رکھیں ، آدھی رات کے بعد " بابو دھرنی دھر " اور " بابو رام نومی " اس گاؤں سے جہاں ان کو گاندھی جی نے تحقیقات کرنے کے لئے

بھیجا تھا۔ لوٹے۔ اسی وقت گاندھی جی نے وہاں کا حال سن لیا اور جو کچھ ان لوگوں سے الگ ہونے کے بعد ہوا تھا وہ سب ان سے کہہ دیا۔ ان لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ مقدمہ کی پیشی کے بعد ان کو سزا ضرور ہوگی اور جیل چلے جائیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے پوچھا کہ «اس کے بعد آپ لوگ کیا کرینگے؟» یہ سوال ایسا تھا کہ اس کا جواب دینا ان لوگوں کیلئے مشکل تھا کیونکہ اس قسم کے واقعہ کا ان لوگوں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا کوئی دوسرا موجود بھی نہ تھا جس سے رائے لیتے، اور اسکے ساتھ ھی بغیر جواب دئے وہ بھی نہیں سکتے تھے۔ بابو دھرنی دھر ایک بڑے صاف اور کھرے بولنے والے، اپنی قسم کے بے ڈھنگے آدمی تھے۔ وکالت خوب چل رھی تھی اور سوال جواب کرنا جانتے ھی تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ «آپ تو ہم لوگوں کو ترجمانی کے کام کیلئے لائے تھے۔ وہ کام آپ کے جیل جانے کے بعد ختم ہو جائیگا۔ اور ہم لوگ بیکار ہوجائینگے اس لئے ہم لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جائینگے» مہاتما جی نے پوچھا «اور کیا آپ لوگ

ان غریب کسانوں کو یوں هی چھوڑ دینگے؟» انہوں نے جواب دیا «اور هم لوٹ کر هی کیا سکتے هیں کیونکه هم سمجھ هی نہیں سکتے هیں که هم لوگ اور کیا کر سکتے هیں لیکن اگر آپ چاهیں تو جس طرح ان کی حالت دیکھی اور ان کی شکایتوں کی جانچ کرنی آپ چاهتے تھے. اس طرح جب تک هم لوگوں سے یه هو سکیگا، هم کرینگے. مگر گورنمنٹ نے اگر هم لوگوں کو بھی آپ هی کی طرح ضلع چھوڑ کر چلے جانیکا حکم دیا تو هم لوگ آپکی طرح عدول حکمی نہیں کرینگے بلکه اسکی تعمیل کر کے چپ چاپ چلے جائینگے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو سب باتیں سمجھا کر کام جاری رکھنے کیلئے بھیج دینگے» مہاتما جی یه گفتگو سن کر خوش هوگئے لیکن پوری طور پر مطمئن نہیں هوئے. اور کہا «بہت اچھا ایسا هی کیجئے گا اور جہاں تک هو سکے سلسله جاری رکھئے گا. یه باتیں سن کر کے وہ سب لوگ سونے چلے گئے، رات تھوڑی هی رہ گئی تھی.

جواب تو گاندھی جی کو ان دونوں نے دے دیا تھا، مگر وہ خود بھی مطمئن نه تھے، وہ آپس میں بات چیت کرنے

لگے کہ ہم لوگ جو یہاں کے رہنے والے ہیں اور کسانوں کی مدد کا دم بھرا کرتے ہیں، دو چار دن کے بعد اپنے گھروں کو چلے جائینگے، وکالت سے پیسے کمانے اور چین آرام سے دن گذارنے لگیں گے اور یہ ایک اجنبی اور انجان آدمی، جس کا نہ تو اس صوبہ سے تعلق ہے اور نہ کسانوں سے کوئی پہلے کی واقفیت یا واسطہ، ان غریبوں کے لئے جیل خانہ میں پڑا رہے گا. یہ بات تو کچھ ٹھیک نہیں ہوگی، ادھر وطن میں دوستوں کو جیل جانے کی اطلاع کرنی تو الگ بات ہے، خود سوچا بھی نہیں تھا، بال بچوں کا کیا ہوگا؟ اور سزا ہونے کے بعد اگر وکالت کی سند چھین لی گئی تو پھر کیا ہوگا؟ اس ادھیڑ بن میں باتیں کرتے کرتے باقی رات بھی گذر گئی.

گاندھی جی کا طریقہ بہار ہی کے لئے نہیں بلکہ سارے ملک کے لئے نیا تھا. کسی نے اس سے پہلے اس طریقہ سے کام کرنا نہیں سکھایا تھا. اس سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے اس کا اندازہ بھی کسی کو نہ تھا، ان میں محنت کی عادت اور کام کرنے کی طاقت بھی حیرت میں ڈالنے والی تھی،

ساری رات جاگ کر لکھنا اور دوسرے دن کے لئے سب کچھ تیار کر لینا ایک ایسی حیرت انگیز بات تھی جس کی مثال وہاں کے لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

جب مجھے تار ملا تو میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ بابو برجکشور کو جو ہم لوگوں کے گرو تھے اور جو اسوقت کلکتہ گئے ہوئے تھے، میں نے سب باتیں تار کے ذریعہ بتادیں اور لکھا کہ « آپ کل صبح تک پہونچ جائیے » مہاتما جی سے میں نے تار کے ذریعہ سے پوچھا کہ مجھ سے کیا خدمت ہوسکتی ہے؟ میں سمجھا کہ شاید مقدمہ کی پیروی میں وکالت کرنی پڑے اور کچھ کتابیں بھی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کہ اس قسم کا حکم اس دفعہ کے تحت دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ مظہرالحق صاحب سے بھی ملا اور سب باتیں ان کو بتائیں۔ تار کا جواب مل چکا تھا کہ دوستوں کے ساتھ آجاؤ، ادھر مسٹر پولک کا بھی تار پٹنہ پہنچ گیا کہ وہ پٹنہ آرہے ہیں اور گاندھی جی کے بلانے پر سیدھے چمپارن چلے جائینگے۔ ہم نے ارادہ کرلیا کہ مرحوم « شمبھو سرن » اور شری انوگو نارائن سنگھ

کو اپنے ساتھ لیکر دوسرے روز سویرے کی گاڑی سے چمپارن چلے جائینگے، مظہرالحق صاحب نے بھی جانے کا ارادہ کرلیا. مسٹر پولک تو جانیوالے تھے ھی، بہت سویرے بابو برجکشور بھی پہنچ گئے. اب ہم لوگ سب چمپارن کیلئے روانہ ہوگئے. وہ گاڑی موتی ھاری دن میں تین بجے پہنچا کرتی تھی، مسٹر پولک نے راستہ میں گاندھی جی کے کام کرنے کا پورا طریقہ پوری تفصیل سے ہم لوگوں کو بتایا اور یہ بتایا کہ وہ تمہاری وکالت کی مدد وھاں نہیں چاھیں گے، بلکہ کسی دوسری طرح سے تم لوگوں کو اس کام میں لگا دیں گے جو وھاں کرنا چاھتے ھیں. ہم لوگ راستہ میں باتیں کرتے جا رھے تھے اور ادھر مقدمہ کی پیشی ھو رھی تھی. دوسرے دن گاندھی جی سویرے ھی تیار ھو کر اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ھوکر کچہری کیلئے روانہ ہوئے وہ دونوں جو کچھ رات بھر سوچتے رھے تھے، اسی سوچ میں اب بھی تھے، لیکن اب ان سے نہ رھا گیا اور انہوں نے گاندھی جی سے کہا «اگرچہ ہم نے اس بارے

میں اس سے پہلے کبھی سوچا تو نہیں تھا مگر جب آپ
اتنی دور سے آ کر ان غریبوں کے لئے جیل خانہ جا رہے
ہیں تو پھر یہاں کے رہنے والے ہم لوگ آپ کو اکیلا
چھوڑ دینا کیسے برداشت کرسکیں گے اس لئے اب ہم نے
بھی سوچا ہے کہ جب آپ جیل چلے جائیں تو ہم لوگ
کام جاری رکھیں گے۔ اور ضرورت پڑے پر ہم لوگ بھی
جیل جائیں گے » یہ سنتے ہی گاندھی جی کا چہرہ کھل گیا
اور وہ فوراً کہہ اٹھے « تب تو فتح ہے » انہوں نے
جنوبی افریقہ کی بہت کچھ باتیں سنائیں، اس عرصے میں وہ
کچہری تک پہنچ گئے۔

کچہری میں آج ایک نیا سماں تھا، گاندھی جی کے
مقدمہ کی خبر پھیل چکی تھی اور کسانوں کی ایک بھیڑ
وہاں جمع ہوگئی تھی، وہ لوگ اپنے ہمدرد کا درشن
کرنے اور مقدمہ میں کیا ہوتا ہے یہ دیکھنے کیلئے گانوں سے
آگئے تھے، وہ لوگ وہی کسان تھے جو ڈر کے مارے
کبھی کچہری کے نزدیک نیل والوں کے خلاف نالش کرنے
نہیں آتے تھے لیکن آج گورنمنٹ کے حکم کی خلاف ورزی

کرنے والے کے مقدمہ کی پیشی دیکھنے وہاں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے اور جب مجسٹریٹ کے پہنچنے پر مقدمہ شروع ہوا، تو کمرہ کے اندر گھسنے میں اتنی دکھم دکھا اور گڑ بڑ ہوئی کہ کواڑوں کے شیشے بھی ٹوٹ گئے اور پولس ھکی بکی رہ گئی، نہ معلوم لوگوں کا وہ ڈر کہاں چلا گیا۔ اور وہ جوش و ہمت کہاں سے آ گئی۔

صرف ہم نے ھی یہ سوچنے میں غلطی نہیں کی تھی کہ گاندھی جی کے مقدمہ کی پیروی ہمیں کرنی پڑے گی، سرکاری وکیل نے بھی سوچا کہ مقدمہ کی پیروی کیلئے گاندھی جی کی طرف سے بڑے بڑے وکیل اور بیرسٹر آئیں گے، گاندھی جی خود بھی بیرسٹر ھیں اس لئے وہ قانون کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر اور تیار ہوکر کچہری آئیں گے، یہ ایک قانونی سوال اس مقدمہ میں ضرور اٹھتا تھا کہ وہ حکم قانون کے مطابق ٹھیک تھا یا نہیں، اور اگر وہ ٹھیک نہیں تو اس کی خلاف ورزی کیلئے سزا نہیں ہو سکتی تھی۔ میں جو کچھ تھوڑا سا سوچا تھا تو اس وقت اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ ضلع مجسٹریٹ کا حکم قانوناً غلط ہے۔ اور ان کو اس کی

عدول حکمی پر سزا نہیں ہو سکتی تھی، شاید سرکاری وکیل نے بھی سوچا تھا کہ اس طرح کی بحث کی جائیگی اور اس کا جواب دینے کے لئے انہوں نے مسالہ تیار کر لیا تھا، لیکن جب مقدمہ پیش ہوا تو یہ ساری کتابی محنت بیکار اور غیر ضروری ثابت ہوئی، مقدمہ پیش ہونے پر سرکاری وکیل نے گواہ پیش کیا، اور اس سے اس طرح پوچھنے لگے، جس کے جواب سے یہ ثابت ہوا کہ گاندھی جی پر وہ حکمنامہ باضابطہ تعمیل ہوگیا تھا، جسکی خلاف ورزی کرنے پر مقدمہ چل رہا تھا گاندھی جی نے حاکم سے کہا کہ گواہی غیر ضروری ہے اس میں کیوں ہمارا اور آپ کا وقت ضائع کیا جائے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ حکم مجھکو ملا تھا اور میں نے اس کے ماننے سے انکار کر دیا ہے، اگر آپ اجازت دیں تو مجھے جو بیان کرنا ہے اور جس کو میں لکھ کر لایا ہوں پڑھ دوں۔

مجسٹریٹ اور سرکاری وکیل دونوں کیلئے اور دوسرے جتنے لوگ کچہری میں موجود تھے، سب کے لئے مقدمہ کی پیروی کا یہ ایک بالکل نیا طریقہ تھا، اور سب اچنبھے

مین رہ گئے کہ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ مجسٹریٹ نے بیان پڑھنے کی اجازت دیدی گاندھی جی نے اسے اسطرحسے سنایا۔

"عدالت کے حکم سے میں مختصر طور پر یہ بتا دینا چاھتاھون کہ نوٹس کے ذریعہ سے مجھے جو حکم دیا گیا اس کی خلاف ورزی میں نے کیونکی۔ میرے خیال میں یہ میرے اور مقامی حاکمون کے درمیان اختلاف رائے کا سوال ہے۔ میں اس صوبہ میں قومی اور انسانی خدمت کرنیکے خیال سے آیا ہون یہان آ کر ان کسانون کی مدد کرنے کیلئے، جنکے ساتھ کہا جاتا ہے کہ "نیل والے صاحب لوگ" اچھا برتاؤ نہیں کرتے مجھ پر بہت زور دیا گیا تھا لیکن جب تک میں سب باتیں اچھی طرح نہ جان لیتا اس وقت تک کسانون کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ اسلئے میں اگر ہوسکے تو حاکمونکی اور نیل والونکی مدد سے سب باتیں جاننے کیلئے آیا ہون میں کسی دوسرے مقصد سے یہاں نہیں آیا ہون مجھے یقین نہیں ہوتا کہ میرے یہان آنیسے کسی قسم کی بدامنی یا بے چینی ہوسکتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہون کہ ایسی باتون کا مجھے خود بہت خیال رہتا ہے حکام کو جو مشکلات ہوتی ہیں انکو میں سمجھتا ہون میں یہ بھی مانتا ہون

کہ انکو جو حکم ہوتا ہے صرف اسی کے مطابق وہ کام کرسکتے ہیں. قانون ماننے والے شخص کی طرح میرا رجحان یہی ہونا چاہئے تھا. اور یہی رجحان ہوا بھی کہ میں اس حکم کی تعمیل کروں لیکن میں ان لوگوں کی خاطر جن کیلئے یہاں آیا ہوں اپنے فرض سے ہٹ نہین سکتا تھا. میں سمجھتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں رہ کر ہی ان کی بھلائی کیلئے کچھ کرسکتا ہوں اس لئے خوشی سے میں اس مقام سے نہیں جا سکتا تھا. دو فرائض کے باہم اختلاف کی حالت میں میں صرف یہی کرسکتا تھا کہ اپنے آپ کو یہاں سے ہٹانے کی ساری ذمہ داری حاکموں پر ڈال دوں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہندوستان کی پبلک زندگی میں مجھ جیسی حیثیت کے لوگوں کو نمونہ یا مثال پیش کرنے میں بہت ہی متوجہ رہنا پڑتا ہے. میرا مضبوط بھروسہ ہے. کہ جس حالت میں میں ہوں. اسی حالت میں ہر ایک عزت دار شخص کیلیے وہی کام کرنا سب سے اچھا ہے جسے کرنے کا اس وقت میں نے ارادہ کرلیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بغیر کسی قسم کی مخالفت کے حکم نہ ماننے کی سزا سہنے کیلئے تیار ہوجاؤں میں نے جو بیان دیا ہے وہ اسلئے

نہیں ھے کہ جو سزا مجھے ملنے والی ھے وہ کم کی جائے بلکہ یہ دکھانے کے لئے کہ میں نے سرکاری حکم کی خلاف ورزی اس وجہ سے نہیں کی کہ میرا سرکار کے بارہ میں عقیدہ نہیں ھے بلکہ اس وجہ سے کی ھے کہ میں نے اس سے بھی بڑھ کر حکم یعنی اپنی عقل کے حکم کی تعمیل کو مناسب سمجھا »

یہ بیان سنتے ھی سب لوگ دنگ رہ گئے اس طرح کا بیان اس سے پہلے شاید ھندوستان کے کسی برٹش کچہری میں نہ کسی نے دیا تھا اور نہ سنا تھا. مجسٹریٹ بھی ھکا بکا رہ گیا، اس نے تو سوچا تھا کہ اور مقدموں کی طرح اس میں بھی گواھی ھوگی اور اس کے بعد بحث ھوگی اور ان سب باتوں میں کافی وقت لگیگا. اس وقت تک وہ ضلع مجسٹریٹ سے بھی مشورہ کرسکے گا کہ اسے کیا فیصلہ کرنا چاھئے اور کتنی سزا دینی چاھئے وغیرہ وغیرہ لیکن اس بیان کے بعد نہ تو گواھی کی ضرورت رھی اور نہ بحث کی اب صرف ایک بات رہ گئی تھی. وہ یہ کہ کیا اور کتنی سزا دینی چاھئے، اس کے لئے ابھی وہ تیار نہ تھا، اس نے کہا:

« آپ نے بیان تو پڑھ دیا لیکن جو کچھ آپ نے ابتک کہا ھے اس میں آپ نے صاف نہیں کہا ھے کہ آپ قصور وار ھیں یا نہیں »

گاندھی جی نے جواب دیا کہ « مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا » اس پر اس نے یہ سوچ کر کہ ابھی بحث کی گنجائش ھے کہا کہ « تو پھر مجھے گواھی بھی لینی اور بحث بھی سننی پڑیگی » گاندھی جی بھی بھلا کب چوکنے والے تھے انہوں نے فوراً جواب دیا کہ « اگر ایسا ھے تو لیجئے میں اقبال کرتا ھوں کہ میں قصور وار ھوں » اب اس کے پاس کوئی بھی راستہ وقت ٹالنے کا نہیں رھا اس لئے اس نے کہا کہ « میں چند گھنٹوں نے بعد حکم سناؤنگا » اس عرصے کیلئے آپ ضمانت دے کر جاسکتے ھیں » گاندھی جی نے جواب دیا کہ « میرے پاس کوئی ضمانت دینے والا نہیں ھے اس لئے میں ضمانت نہیں دونگا » اب اس کیلئے پھر ایک سخت مشکل سوال سامنے آ گیا کہ آیا گاندھی جی اسوقت تك پولس کی حوالات میں رکھے جائیں یا کیا کیا جائے؟ اس نے کہا کہ « اگر ضمانت نہیں دے سکتے ھیں تو ذاتی مچلکہ دیدیجئے .

گاندھی جی نے جواب دیا کہ « میں یہ بھی نہیں کرسکتا ہوں » اس پر اس نے کہا کہ « اچھا میں تین بجے حکم سناؤنگا اس وقت آپ حاضر ہوجائیے » گاندھی جی نے کہا « ہاں وقت پر ضرور حاضر ہوجاؤنگا »

مجسٹریٹ اجلاس سے اٹھکر چلا گیا . گاندھی جی کہیں دوسری جگہ جانیوالے تھے کہ ضلع سپرنٹنڈنٹ پولس کی طرف سے پیام آیا کہ وہ ان سے ملنا چاہتا ہے ، پولس سپرنٹنڈنٹ انگریز تھا ، جو شاید جنوبی افریقہ کا رہنے والا تھا یا جنوبی افریقہ سے اس کا کوئی تعلق تھا . اس سے وہ ملے اور وہ کچھہ دیر تک باتیں کرتا رہا ، جس میں شاید جنوبی افریقہ کے متعلق بھی کچھہ باتیں تھیں . جب تین بجے کا وقت قریب آیا تو مجسٹریٹ نے گاندھی جی کے پاس کہلا بھیجا کہ وہ اس دن حکم نہیں سنائیگا اور اس کے لئے پانچ چھہ روز کے بعد کا کوئی دن مقرر کردیا . یہ سن کر گاندھی جی اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے . وہاں بھی کسانوں کی بھیڑ جمع تھی .

ادھر تقریباً اسی وقت ہماری گاڑی پہونچی اور ہم لوگ

سیدھے گاندھی جی کی قیام گاہ پر پہنچے کہ وہ بھی کچہری
سے تھوڑی دیر پہلے واپس آئے تھے. ہم لوگوں کو
دیکھکر خاص کر مظہرالحق صاحب اور مسٹر پولک کو
دیکھکر خاص طور سے خوش ہوئے. ہم لوگوں کا ایک
ایک کر کے تعارف کرایا گیا، جب میری باری آئی تو مجھے
دیکھ کر مسکرائے اور بولے «آپ بھی آ گئے میں تو آپ
کے گھر گیا تھا» یہ پہلے الفاظ تھے جو انہوں نے
خاص طور پر مجھ سے کہے اور میں نے سنے. میں یہ
سن کر شرمندہ ہوا، کیونکہ جو برتاؤ ان کے ساتھ میرے
گھر پر ہوا تھا وہ میں نے سن لیا تھا، انہوں نے سمجھ لیا
کہ میں کچھ شرمندہ ہو رہا ہوں. بس فوراً یہ بات کاٹ کر
مقدمے کی باتیں ہم لوگوں سے کرنے لگے، اس وقت تک جو
کچھ ہوا تھا مختصر طور پر وہ سب بتا دیا اور آخر میں کہا
کہ آپ لوگوں کے جو دو ساتھی ہیں ان سے پوری کیفیت
سب لوگ سن لیجئے، میں مسٹر پولک سے بات کرتا ہوں
اس قیام گاہ میں ایک برآمدہ تھا جس میں ایک چوکی رکھی
تھی اس پر گاندھی جی بیٹھے ہوئے تھے، وہ چوکی اتنی

بڑی نہیں تھی کہ اس پر سب بیٹھ سکتے۔ اس لئے کچھ بیٹھ کر اور کچھ کھڑے ہوکر باتیں سنتے رہے، آخر میں ہم لوگ کمرہ کے اندر چلے گئے اور وہاں سب باتیں پوری تفصیل کے ساتھ اپنے دوستوں سے سن لیں، ان لوگوں کے جیل جانے کے ارادوں کو بھی سن لیا اس کے بعد وہی سوال ہم لوگوں سے بھی کیا گیا۔ ان دونوں کے ارادوں کے بعد ہم لوگ کر ہی کیا سکتے تھے۔ اس لئے ہم نے بھی وہی ارادہ کر لیا۔

گاندھی جی جب مسٹر پولک سے باتیں کر چکے، اور ہم لوگوں کے پاس آئے تو انہوں نے ہم سے پوچھا کہ سب باتیں معلوم ہو گئیں۔ ہمارے «ہاں» کہنے کے بعد ایکبارگی انہوں نے جیل جانے کا سوال بھی کر لیا، ہم لوگوں نے اس سوال کا جواب جیسا ہونا چاہئے تھا ویسا دے دیا، وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے لیکن اسی حد تک وہ بات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے کاغذ پنسل ہاتھ میں لیکر کہا کہ «ہمارے جیل چلے جانے کے بعد آپ لوگ دو دو آدمیوں کی ٹولی میں جانچ کا کام جاری

دکھیں گے اور جب گورنمنٹ ایک ٹولی کو جیل بھیج دے
تو دوسری ٹولی آجائے اور اس طرح سے آپ لوگ کام
چلاتے رہئے، اور اگر دوسرے بھی آپ ھی کی طرح تیار
ھوجائیں تو وہ بھی ایسا ھی کریں. یہ کہکر انہوں نے
موجودہ لوگوں کی تین ٹولیاں بنادیں. جس میں سے
مظہرالحق صاحب، بابو برجکشور اور مجھے لیڈر بنادیا.
اور سب کے نام بھی لکھ ڈالے. ھم لوگوں میں سے کوئی
بھی اسکے لئے تیار ھوکر نہیں آیا تھا یہ پہلا کام اچانک کرنا
پڑا تھا، ھم نے سوچا کہ یہ اچھا ھوا کہ پانچ چھ روز کا
وقت مل گیا اس درمیان میں ھم سب اپنا نجی کاروبار سمیٹ
لینگے. مظہرالحق صاحب کے پاس ایک سشن (دورہ) کا
مقدمہ تھا جس کی پیشی اسی زمانہ میں ھونے والی تھی،
انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس عرصے میں وہ اس مقدمہ
کو اس دن تک جس روز مجسٹریٹ حکم سنانے والا تھا،
ختم کر کے واپس آجائینگے تا کہ گاندھی جی کے جیل جانے
کے بعد چمپارن کی لیڈری سنبھال لیں. بابو برجکشور پرشاد
بھی اسی طرح کچھ کام پورا کر کے اس دن تک واپس

آجائیں گے، یہ ارادہ کر کے وہ دونوں دوسرے روز سویرے چلے گئے، ہم لوگ رہ گئے.

گاندھی جی کے پاس ضلع مجسٹریٹ کا خط آیا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ «ساری باتیں اس نے گورنمنٹ کو لکھ بھیجی ھیں» اور زور دیا کہ جب تک مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوجانے، گاندھی جی گانوؤں میں نہ جائیں. گاندھی جی نے اس بات کو مان لیا اور ہم لوگ وھیں اس دن کا انتظار کرنے لگے. لیکن اس خط کے پہنچنے پر گاندھی جی کو کچھ ایسا خیال ہوگیا کہ شاید اب گورنمنٹ اس چیز کو آگے نہیں بڑھائیگی اور جیل جانے کا مسئلہ نہیں ھوگا. پھر بھی یہ تو غیر یقینی تھا ھی، انہوں نے اس دن جو کچھ ہوا تھا اس کی اطلاع دوستوں کے پاس اور بڑے بڑے اخباروں کے ایڈیٹروں کے پاس لکھ بھیجی. ایڈیٹروں کو سب باتوں سے واقفیت کے لئے انہوں نے اطلاع دیدی، لیکن ان کی طرف سے کچھ چھاپنے کے لئے نہیں تھا. البتہ اخباروں میں جو کچھ چھپا وہ نامہ نگاروں کی دی ہوئی خبر تھی گاندھی جی کی دی ہوئی نہیں.

باب دوم

گاندھی جی سے میری یہ پہلی ملاقات تھی جس میں ان سے میری دو بدو باتیں ھوئیں. میں یہ نہین کہہ سکتا کہ اس وقت مجھے یہ محسوس ہوا ہو کہ میرے دل پر کوئی بہت بڑا اثر ہوا ھے یا ساتھ ھی ساری زندگی کا رخ اس ملاقات کے ہوتے ھی بدل گیا ہو بہرحال یہ کیسے ھوا میں نہیں کہہ سکتا، مرحوم گوکھلے سے میری ملاقات کئی برس پہلے ھوئی تھی انہوں نے مجھے بلایا تھا اور «سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی» میں شریک ھونے کیلئے کہا تھا، کچھ دیر تک باتیں ھوئی تھیں، دل پر اثر ہوا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ جیسا وہ کہتے ھیں ویسا کرنا چاھئے. کئی روز تک اس پر میں سوچتا بھی رھا لیکن ویسا کر نہ سکا، اس دفعہ کیوں اور کیسے یہ خیال ھوگیا میں نہیں کہہ

سکتا، صرف جیل خانہ جانے ھی کی بات اس دفعہ میرے سامنے آئی. ساری زندگی کو ملک کی خدمت میں لگا دینے کا خیال سامنے نہیں تھا لیکن اس طرح اپنی خوشی سے جیل جانے کا طریقہ بھی تو میرے ھی لئے نہیں بلکہ سارے ملک کیلئے نیا تھا. اسوقت ھم لوگ جیل جانے کا کام کرتے ہوئے بھی اپنے تئیں جیل سے بچانے ھی میں عقلمندی اور ھوشیاری سمجھتے تھے. اگر بغاوت کی کوئی بات ھم کرنی چاھتے، تو کرتے تو تھے لیکن ایسی باتیں کرتے وقت ھمیشہ تعزیرات ہند دفعہ ۱۲٤ (الف) کو سامنے رکھ کر اس طریقہ سے کرتے تھے کہ جس سے اس کے جال میں نہ پھنسیں. ھم سانپ بھی مارنا چاھتے اور ساتھ ھی لاٹھی بھی بچا لینا چاھتے تھے، اور جو اس طرح جتنی کامیابی سے باتیں کرسکتا تھا وہ اتنا ھی ھوشیار سمجھا جاتا. انقلاب پسند لوگ اپنی جان ھتھیلی پر لیکر کام کرتے تھے لیکن ساتھ ھی جہاں تک ھوسکتا تھا اپنی بچت کا بھی راستہ کھلا رکھتے، جان بوجھ کر کوئی آگ میں کودنا نہیں چاھتا تھا. مقدمہ چلتا تھا تو بچاؤ کیلئے وکیلوں کی مدد لی جاتی

تھی اور جو کچھ بھی بچاؤ کیلئے مقدمہ کی پیروی میں ضروری سمجھا جاتا، کیا جاتا تھا. شاید ھی کوئی اپنے قصور کا اقبال کرتا. ہم تو اسی طریقہ کو اس وقت تک جانتے تھے اور اس وقت ہم نے اس طرح کا کوئی خطرہ مول نہیں لیا تھا، میں اپنے کو خیالات اور مزاج کے اعتبار سے نرم دل سمجھتا تھا اور آج بھی سمجھتا ہوں. کیوں اور کیسے؟ اچانک ایسا ارادہ میں نے کرلیا جو صرف ذاتی یا انفرادی زندگی کیلئے ھی ایک نیا راستہ نہیں بتاتا تھا بلکہ اس نے ملک کے سب لوگوں کی زندگی کیلئے بھی ایک نیا دروازہ کھول دیا تھا، البتہ ہمارے سامنے اپنے ان دو دوستوں کا ظاہر کیا ہوا ارادہ تھا جو وھاں پہلے سے گاندھی جی کیساتھ آئے تھے لیکن ہمارے ساتھ مظہرالحق صاحب اور بابو برجکشور پرشاد آئے تھے. وہ دونوں ھی ان سے بڑے سمجھے جاتے تھے. تو کیا دھرنی دھر اور بابو رام نومی نے بغیر سوچے سمجھے ھی پیروی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا؟ اور کیا ہم نے بھی اسی طرح ان کی پیروی کی؟ کیا یہ صرف

ایک بھیڑیا چال تھی ؟ ان سب باتوں کی چھان بین کچھ وقفہ کے بعد ھی کی جاسکتی ھے لیکن اس تھوڑے وقت میں مجھے جہاں تک یاد ھے میں نے کوئی خاص غور نہیں کیا اور جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں پہلے ملاقات کا میرے خیال میں کوئی اتنا بڑا اثر مجھ پر نہین ھوا تھا کہ جو بات مرحوم گوکھلے کی ملاقات اپنے گہرے اثر کے باوجود نہیں کر سکی تھی وہ یہ ملاقات کر دیتی پھر بھی ایسا ھوا تو یہ ھوسکتا ھے کہ باپو کی قوت کشش نے خفیہ طور پر کام کیا اور ھم کو ان کے اثر کا پتہ بھی نہ لگنے دیا ۔

میں نے پہلی ملاقات کی باتوں کی اتنی پوری وضاحت اس لئے کی ھے کہ پڑھنے والے پوری طرح سے صحیح باتوں سے واقف ھوجائیں ، کیونکہ جو کچھ ان چند دنوں میں گاندھی جی نے چمپارن میں کیا اسی کا اثر « نان کواپریشن » تحریک کے ذریعہ سارے ملک میں بھی پھیلا ، وھاں انہوں نے پیپل کا وہ بیج لگا دیا جس کو کسی نے دیکھا بھی نہیں اور وقت پا کر وھی اگا اور بڑا درخت ھوگیا جس

کے سائے میں ملک نے غیر ملکی راج سے نجات پائی اور اسی کے سایہ میں ہم سچے آریہ سوراج پانے کی امید رکھتے ہیں.

اس پر کچھ اور سوچیں اور دیکھیں، غریب جنتا کی دکھ بھری کہانی نے ان کو اپنی طرف کھینچا لیکن جب تک سب باتوں کی پوری طرح وہ جانچ نہ کرلیں اور انکو یہ پورا یقین نہ ہوجائے کہ جن شکایتوں کو وہ دور کرنا چاہتے ہیں وہ سچی ہیں وہ کچھ کرنا چاہتے تھے یہاں تک کہ وہ بہت زور دینے پر بھی کانگریس میں ایک ایسے کمزور ریزولیوشن پر بولنے کیلئے راضی نہ ہوئے، جس میں گورنمنٹ پر صرف اتنا ھی زور دیا گیا تھا، کہ وہ شکایتوں کی جانچ کرائے ساتھ ھی موقع پانے ھی. انہوں نے جاننے کیلئے جانچ کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کیا، مظفر پور پہونچکر انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ جو کرنا چاھتے تھے اسکی اطلاع انہوں نے مخالفوں کو دی اور ان کی مدد بھی انہوں نے مانگی. دو مخالف تھے ایک نیل والے جن کی زیادتیوں کے متعلق وہ جانچ

کرنے آئے تھے، اور دوسرے سرکاری ملازمین جو ان شکایتوں سے رعایا کا بچاؤ نہیں کرسکتے تھے، اور جن کے خلاف یہ شکایت کی کہ وہ نیل والوں کی طرفداری کرتے ہیں اور غریبوں کو ستانے میں مدد دیتے ہیں، ان دونوں مخالفوں کے نمائندوں سے انہوں نے ملاقات کی، نیل والوں کی انجمن کے صدر اور ترہٹ ڈویژن کے کمشنر سے بھی سب باتیں کیں اور ان کو اپنا مقصد بتایا، اور اس کی تکمیل کیلئے ان سے مدد مانگی، مدد نہ ملنے اور ان کے منع کرنے پر بھی اپنا مقصد انہوں نے نہ چھوڑا اور اپنے کام میں لگے رہے۔ چمپارن کی غریبی کا حال وہ سن چکے تھے لیکن وہاں پہونچنے کے پہلے ہی مظفر پور میں انہوں نے گاوؤں کی بری حالت کا نمونہ دیکھ لیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک ان گانوؤں کی حالت نہ سدھریگی ملک ترقی نہیں کرسکتا۔

موتی ہاری پہونچکر انہوں نے اپنا ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔ کمشنر سے بات چیت کے بعد ہی شاید ان کو سندیسہ مل گیا تھا کہ گورنمنٹ ان کو چمپارن میں جانچ

نہ کرنے دیگی اس لئے وہ جلد سے جلد وہاں پہونچنا چاہتے تھے اور گورنمنٹ کی کارروائی سے پہلے جہاں تک جو کچھ ہوسکتا تھا اسے دیکھ لینا چاہتے تھے، سننے کا کام تو لکھنؤ میں شروع ہوا، جو مظفر پور اور موتی ہاری میں جاری رہا لیکن دیکھنے کا کام مظفر پور ہی سے شروع ہوگیا۔ اور موتی ہاری پہونچکر تو اور گہرائی مین جانے کا ارادہ پیدا ہوگیا. صرف ارادہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس ارادے کے مطابق کام بھی شروع ہوگیا، شروع ہی میں گورنمنٹ کی طرف سے رکاوٹ بھی پڑی. دفعہ ١٤٤ کی نوٹس کے نہ ماننے کا فیصلہ بھی اسی تیزی کیساتھ کیا گیا، جس تیزی کیساتھ اور سب کام کئے جارہے تھے. مقدمہ چلنے پر اپنا بچاؤ نہ کر کے ان سبھی باتوں کا اقبال کرلیا جن کو انہوں نے کیا تھا، اس لئے جو بھی سزا ہو اسے مستقل مزاجی سے برداشت کرنے کا ارادہ بھی مجسٹریٹ پر ظاہر کر دیا. یہ ایک نئی چیز تھی اس وقت جو بیان انہوں نے دیا تھا اس میں ایک طرح سے ان کے اس بیان کی گونج تھی جو

انھوں نے سنۂ ۱۹۲۲ مین اپنے اوپر بغاوت کا مقدمہ چلنے پر احمدآباد سشن جج کے سامنے دیا تھا وہ بیان یہاں نیچے لکھا جاتا ھے محنت اور پوری توجہ کا نمونہ ھم لوگوں کیلئے تو تھا ھی لیکن وہ ان کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا. سادگی اور ضبط بھی ھمارے لئے نئی باتیں تھیں. مگر ان کی زندگی کا تو وہ بھی پہلے ھی سے جز بنے ہوئے تھے، جو روز بروز اور بھی ویسے ھی بڑھتے گئے جیسے جیسے کام کا میدان بڑھتا گیا.

«احمدآباد کا بیان*»

میری پبلک زندگی کا آغاز سنۂ ۱۸۹۳ میں جنوبی افریقہ کے سخت حالات میں ھوا کیونکہ اس ملک کے برٹش حاکموں کے ساتھ میرا ابتدائی میل جول اچھا نہ رہا. مجھے معلوم ھوا کہ ایک انسان اور پھر ایک ھندوستانی کی حیثیت سے میرا وھاں کوئی مرتبہ ھی نہیں ھے، میں نے یہ بھی پتہ لگا لیا کہ بحیثیت انسان وھاں میرا کوئی مرتبہ

* یہ مقدمہ احمدآباد کے دورہ' جج کے اجلاس پر سنۂ ۱۹۲۲ میں ۱۸ مارچ سے شروع ھوا.

اس وجہ سے نہیں ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، لیکن میں نے ہمت نہ ہاری، میں یہ سمجھا تھا کہ ہندوستانی کے ساتھ برا برتاؤ کئے جانے کا گناہ ایک اچھی خاصی منظم حکومت میں یونہی آکر گھس گیا ہے، میں نے خود ھی سرکار کے ساتھ دل سے تعاون کیا. جب کبھی میں نے سرکار میں کوئی قصور پایا تو میں نے اس کی خوب تحقیقات کی، میں نے اس کی تباھی کی خواهش کبھی نہیں کی.

جب سنۂ ۱۹۸۰ میں بوئروں کے چیلنج نے سارے برطانوی سامراجیوں کو بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا تھا، تب میں نے اس موقع پر اپنی خدمات پیش کی تھیں. یعنی زخمیوں کے لئے ایک خدمتی جماعت بنائی، اور « لیڈی اسمتھ » کی حفاظت کے لئے جو لڑائی لڑی گئی اس میں میں نے کام کیا، اسی طرح جب سنۂ ۱۹۰۶ میں « زولو* » قوم نے بغاوت کی تو میں نے اسٹریچر (زخمیوں کا پلنگ) پر زخمیوں کو لیجانیوالا گروہ بنایا اور جب

---

* افریقہ کے جنگلی باشندے [م]

تک بغاوت دب نہ گئی برابر کام کرتا رھا. ان دونوں موقعوں پر مجھے تمغے ملے اور خریطوں تک مین میرا ذکر کیا گیا، جنوبی افریقہ میں میں نے جو کام کیا اس کے لئے لارڈ ھارڈنگ نے مجھے قیصر ھند تمغہ دیا، جب سنۂ ۱۹۱٤ میں انگلستان اور جرمنی میں لڑائی چھڑی تو میں نے «لندن» میں ھندوستانیوں کی ایک والنٹیر کور (رضا کار جماعت) بنائی، اس میں سینیر طلباء تھے. حکام نے اس جماعت کے کاموں کو سراھا. جب سنۂ ۱۹۱۷ مین «لارڈ چمسفورڈ» نے دلی کی جنگی کونسل میں خاص طور سے اپیل کی تو میں نے «کھیڑا» میں رنگروٹ بھرتی کرتے ھوئے اپنی تندرستی تک جوکھوں میں ڈال دیا. مجھے اس میں کامیابی ھورھی تھی کہ لڑائی بند ھوگئی. اور حکم دیا گیا کہ اب مزید رنگروٹ نہیں چاھئیں. ان ساری خدمتوں میں میرا صرف ایک ھی یقین رھا کہ اس طرح سے میں سامراج میں اپنے ھم ملکوں کے لئے برابری کا درجہ حاصل کرسکوں گا.

پہلا دھکا مجھے رولٹ ایکٹ (کالا قانون) نے دیا.

یہ قانون جنتا کی اصلی آزادی کو تہس نہس کرنے کیلئے بنایا گیا تھا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس قانون کے خلاف مجھے ایک زبردست تحریک اٹھانی چاہئے. اس کے بعد پنجاب کے خوفناک باب کا نمبر آیا جو « جلیانواله باغ » کے قتل عام سے شروع ہوا، اس کا انجام یہ ہوا کہ نہ صرف وہاں کے لوگ پیٹ کے بل رینگائے گئے اور کھلے بندوں ان کے بید لگائے گئے. بلکہ اس کے علاوہ بیان سے باہر بے عزتی کی گئی. مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ وزیر اعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو امید دلائی تھی. کہ ترکوں اور اسلام کے مقدس مقاموں کی حرمت اور بزرگی کا خیال رکھا جائیگا. وہ محض وعدہ ہی رہے گا.

سنۂ ۱۹۱۹ کی امرتسر کانگرس میں کئی دوستوں نے مجھے متنبہ اور آگاہ کیا اور میری معقول پالیسی میں رخنہ ڈالا لیکن پھر بھی میں اس یقین پر جما رہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ وزیراعظم نے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کیا جائیگا، پنجاب کے زخم بھرے جائیں گے اور

نئی اصلاحات نا کافی اور غیر اطمینان بخش ہونے پر بھی ہندوستان کی زندگی مین ایک نئی امید پیدا کرینگے اسی لئے میں تعاون اور « مانٹیگو چمسفورڈ سکیم » کو مفید بنانے کی بات پر جما رہا.

لیکن میری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں، خلافت کے متعلق وعدہ پورا کیا جانے والا نہیں تھا. پنجاب کے متعلق زیادتیوں پر لیپا پوتی کر دی گئی. ادھر آدھے پیٹ بھوکے رہنے والے ہندوستانی آہستہ آہستہ فنا ہو رہے ہیں جو یہ نہیں سمجھتے کہ انہیں جو تھوڑا بہت آرام مل جاتا ہے. وہ بدیشی لٹیروں کی دلالی کرنے کی وجہ سے ہے. اور سارا نفع اور دلالی جنتا کے خون سے نکالی جاتی ہے. وہ یہ نہیں جانتے کہ برطانوی ہند میں جو حکومت قانوناً قائم ہے وہ جنتا کا مال لوٹنے کیلئے چلائی جاتی ہے، چاہے جتنے جھوٹے سچے طریقوں سے کام لیا جائے، ہندوستان کے ساتھ چاہے جیسی چالاکی کی جائے لیکن بے شمار گانوؤں میں، جو قحط زدہ دکھائی دے رہے ہیں. ان کی کھلی ہوئی گواہی کسی طرح جھٹلائی

نہیں جاسکتی. اگر ہمارا کوئی خدا ہے تو مجھے اس
کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ تاریخ میں اپنے
ڈھنگ کا نرالا کہلانے کے قابل جو یہ گنناہ کیا جارہا
ہے اس کی جواب دہی انگلستان کی پبلک اور ہندوستان
کے شہریوں پر ہوگی، اس ملک میں قانون کا استعمال
بدیشی لٹیروں کے فائدے کیلئے کیا گیا ہے. پنجاب
کے فوجی قانون کے متعلق میں نے جو غیر جانبدارانہ جانچ
کی ہے اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ نوے (۹۰)
فی صد معاملوں میں سزا کے فیصلے بالکل غلط رہے.
ہندوستان کے سیاسی مقدموں کا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ
نوے (۹۰) فی صد سزا یافتہ آدمی بالکل بے قصور تھے،
ان آدمیوں کا صرف اتنا ہی جرم تھا کہ وہ اپنے ملک
سے محبت کرتے تھے. ۹۹ فی صد معاملات میں دیکھا
گیا ہے کہ ہندوستان کی عدالتوں میں ہندوستانی کے
ساتھ یوروپین کے مقابلہ میں انصاف نہیں کیا جاتا. میں
مبالغ سے کام نہیں لے رہا ہوں جتنے ہندوستانیوں کو اس
قسم کے معاملات میں کام پڑا ہے، ان کا تجربہ یہی ہے

میری رائے میں قانون کا غلط استعمال جان بوجھ کر سہی یا بغیر جانے بوجھے، مال لوٹنے کیلئے کیا جاتا ہے۔

سب سے بڑی بد نصیبی کی بات یہ ہے کہ جن انگریزوں اور انکے ہندوستانی مددگاروں کے ذمہ اس ملک کی حکومت کا بوجھ ہے، وہ خود یہ نہیں جانتے کہ یہاں بیان کئے ہوئے جرموں میں ان کا بھی ہاتھ ہے، میں اچھی طرح سے واقف ہوں کہ بہت سے انگریز اور ہندوستانی حاکم اس پر دل سے یقین رکھتے ہیں کہ ملک کا جو انتظام وہ کر رہے ہیں وہ دنیا بھر کے ملکی انتظاموں میں سے ایک ہے اور ہندوستان اگرچہ آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور سے ترقی کر رہا ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ کسقدر خوبصورتی کیساتھ مگر خاص ڈھنگ سے خوف کا سکہ بٹھایا گیا ہے اور کس طرح ایک اور طاقت کا اجتماعی مظاہرہ کر کے دوسری طرف حفاظت خود اختیاری کی یا جواب میں وار کرنے کی تمام طاقتیں چھین کر لوگ بے جان اور ذلیل کر دئے گئے ہیں، اس سے لوگوں کو اب اسی طرح رہنے کی عادت پڑ گئی ہے کہ جس سے حکومتی طبقہ

کی جہالت اور خود فریبی اور بھی بڑھ گئی ھے جس دفعہ ۱۲٤ (الف) کے تحت مجھ پر مقدمہ چلایا گیا وہ شہریوں کی آزادی کو تہس نہس کرنے میں تعزیرات ہند کی دفعات مین سرتاج ھے، محبت نہ تو پیدا کی جاسکتی ھے اور نہ قاعدہ قانون کے ماتحت رہ سکتی ھے. اگر کسی آدمی کے دل میں کسی دوسرے آدمی کی محبت کا جذبہ نہ ھو تو جب تک وہ اپنے خیال یا عمل سے کوئی تشدد ظاھر نہ کرے اس وقت تک اسے اپنے جذبۂ نفرت کے ظاھر کرنے کا پورا پورا اختیار ھونا چاھئے، لیکن «شری یت بیکر» اور مجھ پر جس دفعہ کو لگایا گیا ھے اس کے مطابق نفرت پھیلانا جرم ھے. اس دفعہ کے مطابق چلائے ھوئے چند مقدموں کا میں نے مطالعہ کیا ھے اور جانتا ھوں کہ اس دفعہ کے مطابق ملک کے کئی محبوب لیڈروں کو سزا دی گئی ھے اس لئے اس دفعہ کے مطابق مجھ پر جو مقدمہ چلایا گیا ھے اس میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ھوں. میں نے مختصراً اپنی نفرت کے اسباب کو ظاھر کردیا

ہے، کسی حاکم کے بارہ میں میرے دل میں کسی قسم کا برا خیال نہیں ہے، خود بادشاہ کی شخصیت کے بارے میں تو مجھ میں نفرت کا جذبہ بالکل نہیں ہے، لیکن جس مہذب حکومت نے اس ملک کو دوسری ساری منظم حکومتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ نقصان پہونچایا ہے، اس کے بارے میں میں نفرت کا جذبہ رکھنا عمل صالح سمجھتا ہوں۔ انگریزوں کی عملداری میں ہندوستان میں بمقابلہ دوسری عملداریوں کے انسانیت کا مرتبہ بہت گر گیا ہے، اس عقیدے کے ہوتے ہوئے اس مہذب حکومت کے بارے میں محبت کا جذبہ رکھنا میں گناہ سمجھتا ہوں، اس لئے میں نے اپنی ان تحریروں میں جو میرے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کی گئیں ہیں، جو کچھ لکھا ہے اسے لکھنا اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔

حقیقت میں میرا یقین تو یہ ہے کہ انگلستان اور ہندوستان۔ جس غیر فطری شکل سے رہتے ہیں، اس سے عدم تعاون کے ذریعہ نجات پانے کا راستہ بتا کر میں نے دونوں ملکوں کی ایک خدمت کی ہے، میری رائے میں

جس طرح اچھائی سے تعاون کرنا ایک خدمت ھے اسی طرح برائی سے عدم تعاون کرنا بھی ایک خدمت ھے، اس سے پہلے برائی کرنے والے کو نقصان پہنچانے کے لئے مضرت رساں ڈھنگ سے عدم تعاون ظاھر کیا جاتا رھا ھے، لیکن میں اپنے ملک والوں کو یہ بتانے کی خواھش کر رھا ھوں کہ ھنسا (تشدد) برائی کو قائم رکھتا ھے، اس لئے برائی کی جڑ کاٹنے کیلئے یہ ضروری ھے کہ تشدد سے وہ بالکل الگ رھیں، اھنسا کا مطلب یہ ھے کہ برائی سے عدم تعاون کرنے کیلئے جو کچھ بھی سزا ملے اسے منظور کرلیں. اس لئے میں یہاں اس کام کی پاداش میں جو قانون کی نگاہ مین جان بوجھ کر کیا ھوا جرم ھے، اور جو میری نگاہ میں کسی شہری کا سب سے بڑا فریضہ ھے. سب سے بڑی سزا چاھتا ھوں اور خوشی سے اسے بھگتنے کیلئے تیار ھوں آپ کے جج اور اسیروں کے سامنے صرف دو ھی راستے ھیں. اگر آپ لوگ دل سے سمجھتے ھیں کہ جس قانون پر عمل کرنے کے لئے آپ سے کہا گیا ھے وہ برا ھے

اور میں بے قصور ہوں تو آپ لوگ اپنی خدمتوں سے استعفاء دے دیں اور برائی سے اپنا تعلق توڑ دیں یا اگر آپ کا یہ یقین ہے کہ جس قانون پر عمل کر کے آپ مدد کر رہے ہیں وہ ملک حقیقت میں اس ملک کی جنتا کی بہتری اور بہبودی کے لئے ہے اور میرا یہ طریقہ لوگوں کو نقصان پہونچانے والا ہے تو مجھے زیادہ سے زیادہ سزا دیں»

چمپارن میں پہونچتے ہی ان کو بآسانی کچھ کام کرنے والے بھی مل گئے، جنہوں نے ممکن ہے کہ بغیر جانے بوجھے اور سوچے سمجھے ان کی پیروی اور نقل کی ہو. چمپارن کا میدان بھی چھوٹا تھا، اس لئے تھوڑے لوگوں کی تھوڑے ہی دنوں تک کام کرنے کی ضرورت تھی، لیکن جب پورے ملک نے بدیشی راج سے نجات پانے اور سوراج قائم کرنے کا سب سے بڑا کام اپنے ہاتھ مین لے لیا تو کیا ملک کے کروڑوں عورتوں اور مردوں نے ٹھیک اسی طرح ان کی پیروی نہیں کی جس طرح چمپارن میں چند لوگوں نے کی تھی، کیا ملک

نے وہ سب کچھ ترک کر کے نہیں دکھلا دیا جسکی صرف تیاری ہی چمپارن کے کام کیلئے کافی ثابت ہوگئی، آخر میں چمپارن میں پوری کامیابی ہوئی کیونکہ نیل والوں کے جس ظلم کو وہ دور کرنے گئے تھے وہ ختم ہوگیا، ساتھ ہی گورنمنٹ اور نیل والوں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی اچھے رہے. بہت سے تجربے مفید ثابت ہوئے. اس وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کی کارروائیوں سے ان دونوں کا بہت بڑا نقصان ہوگا اور اس وقت شاید کچھ ہوا بھی، لیکن آخر میں وہ نیل والے اپنی کوٹھیوں زمینوں اور دوسرے قسم کے مال مویشیوں کو اچھی قیمتوں پر فروخت کر کے اور دام لیکر خوشی خوشی اپنے وطن کو چلے گئے. ہندوستان کے حصول سوراج کا بھی ٹھیک ایسا ہی نتیجہ اب تک نکلا ہے. اور جو باقی ہے وہ آگے چل کر ویسا ہی شیریں ہوگا. انگریزی سامراج ظاہر میں تو ختم ہوگیا لیکن اس کے ختم ہونے کے باوجود انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان اچھے تعلقات بڑھ گئے ہیں، مجھے یقین ہے کہ حصول سوراج کے بعد

آخر میں انگریزوں کو نقصان نہیں ہوگا بلکہ فائدہ ھی میں رھیں گے. چمپارن مین بھی ایک زبردست نیل والا تھا جو سب کچھ ہوجانے کے بعد بھی آخر تک مخالف بنا رہا لیکن اس کا کوئی خاص اثر نہ تو چمپارن کے لوگوں پر پڑا اور نہ دوسرے لوگوں پر. کیا مسٹر «چرچل» کی وھی حالت نہیں ہوئی؟ جو چمپارن میں مسٹر «اروِن» کی تھی، اس لئے اس وقت بھی میں نے سوچا تھا. اور آج بھی لکھ رہا ہوں کہ گاندھی جی کی سوراج تحریک کا بیج چمپارن میں ھی بویا گیا اور اسی طرح یہ پھولا اور پھلا جس طرح چمپارن میں ہم نے اس کو چھوٹے پیمانے پر پھولتے پھلتے دیکھا تھا، مین نے چمپارن میں مہاتما گاندھی نام کی ایک کتاب سنۂ ۱۹۱۹ میں لکھی تھی، اس کا دیباچہ میں نے حسب ذیل طریقہ پر لکھا تھا، اس وقت ترک موالات تحریک شروع ھی ہوئی تھی. ہم اس وقت نہ تو یہ اندازہ کر سکتے تھے کہ اس میں کتنی سخت رکاوٹیں پڑیں گی؟ کتنی مشکلوں کو ہمیں حل کرنا ہوگا؟ اور اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ اور نہ اس کا اندازہ تھا

کہ اسمیں کتنا وقت لگیگا؟ لیکن جیسا کہ چمپارن کے تجربے نے مجھسے بتایا تھا. مجھسے امید تھی کہ بڑا کام بھی اسی طور پر پورا ہوگا.

چمپارن میں مہاتما گاندھی کی تمہید

یہ کتاب سنۂ ۱۹۱۸ اور ۱۹۱۹ کی درگا پوجا کی چھٹیوں میں لکھی گئی تھی لیکن آج تک ناظرین کی خدمت میں کئی وجوہ سے پیش نہ کی جاسکی اس کتاب کے پڑھنے سے پڑھنے والونکو معلوم ہوجائیگا کہ ستیا گرہ اور نان کواپریشن کے متعلق مہاتما جی نے سنۂ ۱۹۲۰ سے لیکر سنۂ ۱۹۲۲ تک جو کچھ کیا اس کا اشارہ چمپارن کے جھگڑے ھی میں ہوچکا تھا. مہاتما گاندھی نے دکھنی افریقہ سے لوٹ کر سب سے بڑا جو کام کیا تھا وہ چمپارن ھی کا کام تھا، اس وقت ھندوستان میں « ھوم رول » کا بڑا شور تھا. جب ھم مہاتما جی سے کہتے کہ وہ اس تحریک میں چمپارن کو بھی شامل کردیں تو وہ اسکے جواب میں کہا کرتے تھے کہ جو کام

چمپارن میں ہورہا ہے وہی « ہوم رول » قائم کرسکیگا ، اس وقت ملک شاید ہی اس پروگرام کی اہمیت کو سمجھتا ہو ، ہم خود ھی ایسا نہیں سمجھتے تھے لیکن آج جب ہم اس وقت کے طریق کار پر غور کرتے ہیں اور پچھلی تین چار سال کی قومی تاریخ پر دھیان دیتے ہیں اسوقت ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بڑی تحریک جو آج جاری ہے وہ چمپارن ھی کے واقعہ کی ایک بہت زیادہ پھیلی ہوئی شکل ہے ، اگر چمپارن اور کھیڑا کی تاریخیں اکٹھا کرلی جائیں تو جو کچھ « نان کواپریشن » اور ستیہ گرہ کی تحریک نے کیا ہے یا باوجود خواہش کے ابھی تک نہیں ہوسکا ہے وہ سب باتیں ان میں اعلانیہ پائی جائیگی ، جسطرح ہندوستانیوں کو ظلم و زیادتیوں میں دبا ہوا دیکھکر مہاتما جی نے « نان کواپریشن » تحریک کو شروع کیا اسی طرح چمپارن کی رعایا کو بھی ظلم و زیادتیوں کے بوجھ میں دبتا ہوا دیکھکر اور اسکی مدد کرنی اپنا فریضہ سمجھکر انہوں نے وہاں کا سفر کیا تھا جسطرح ہندوستانیوں نے جلسوں ، اخباروں اور کونسلوں کے « ریزولیوشنوں » اور سوالوں کے ذریعہ تحریک کر کے کچھ

فائدہ نہ حاصل کرنے پر ھی ستیہ گرہ اور ترک موالات کو شروع کیا اسی طرح چمپارن میں بھی یہ سب کچھ کر کے تھک جانے پر ھی وھاں کی رعایا. مہاتما گاندھی کو دعوت دی تھی جسطرح اعلانیہ تحریک میں مہاتما جی نے سچائی اور عدم تشدد کو اپنا اصول قرار دیکر دیش کو اسے منظور کرنیکی تعلیم دی ھے اسیطرح اسوقت بھی چمپارن کے مفاس جاھل اور بھولے بھالے کسانوں کو تقریروں اور لیکچروں کے ذریعہ سے نہیں بلکہ اپنے کاموں کے ذریعہ تعلیم دی تھی.

اور سب باتوں کے علاوہ جسطرح آج اپنے اوپر مصیبت اٹھا کر اور خود کو مشکلوں میں ڈالکر ملک کی مدد کرنے کا منصوبہ مہاتما جی نے دیس بھر کے لوگوں کے دلوں میں پیدا کردیا ھے، اسیطرح جیل کیلئے ھر قسم کی مصیبت بھگتنے کیلئے تیار ھوکر انہوں نے وھاں کی رعایا کو بھی وھی اصول سکھایا. وھاں سرکاری افسروں نے مہاتما جی کے مقصد اور رعایا کی تکلیفوں اور انکی ناانصافیوں کو، جو رعایا پر کی گئی تھیں، جانتے ھوئے بھی پہلے مہاتما جی کو روکنا چاھا تھا یہانتک کہ جیل بھیج دینے تک کا انتظام کرلیا تھا.

وھی اس بڑی تحریک کیلئے بھی انہوں نے کیا، مہاتما جی کے چمپارن جانے سے پہلے بھی وھاں کی رعایا نے وقتاً فوقتاً خوفناک اور بھیانک تحریک اٹھائی تھی اور کہیں کہیں «نان کواپریشن» کا بھی ارادہ کیا تھا، لیکن اس تحریک اور نان کواپریشن کی بنیاد عدم تشدد پر نہیں تھی، دوسری طرف نیل والے اور سرکاری افسر جن کا اعتقاد آج تک تشدد پر ھی ھے اور اسکے لئے انکے پاس سامان بھی موجود ھے انکی تشددی تحریک کو برابر دباتے اور انکو اسمیں ھراتے رھے. اس تحریک میں بھی جہاں ھم اس بنیادی اصول سے ھٹ گئے ھیں وھاں اپنی ھار کا سامان خود جمع کرتے گئے ھیں اگر ھم اس اصول اور مسلک کو سامنے رکھکر اس تحریک کو بڑھاتے جائینگے تو اسمیں شک نہیں جسطرح چمپارن میں کامیابی ھوئی تھی اور جیسا کہ پنجاب کے «اکالی» ایک نمونہ ملک کے سامنے پیش کر رھے ھیں جو اپنے کاموں کا پھل بھی پاتے ھوئے دکھائی دیتے ھیں اسیطرح اس عام تحریک میں بھی کامیابی ضروری ھے، چمپارن میں جسطرح سرکار نے خود ان باتونکو منظور کرلیا جنکو وھانکی رعایا ٦٠ سال سے منوانا چاھتی تھی اسیطرح اس تحریک میں بھی جو کچھ ھندوستان چاہ رھا ھے اسکو سرکار منظور کریگی.

تیسرا باب

مقدمہ کا حکم کئی دنوں کے بعد سنایا جانے والا تھا، اس درمیان میں کسانوں میں سے جو لوگ آتے تھے ان کی باتیں سن کر ہم نوٹ کرلیا کرتے لیکن مجسٹریٹ کے حکم کے مطابق تحقیقات کیلئے گاؤں میں نہ ہم میں سے کوئی گیا اور نہ گاندھی جی گئے، مگر پھر بھی کافی بیان سننے میں آتے تھے اور دن بدن حالت سے بہت زیادہ واقفیت ہوتی جاتی تھی، اسی درمیان میں "پادری چارلی اینڈریوز" موتی ھاری پہنچ گئے، وہ وھاں ہندوستانیوں کے بلانے پر تھوڑے ھی دنوں میں "فی جی" (جزیرہ) جانے والے تھے، دنیا بھر میں جہاں جہاں ہندوستانی جا کر رہے تھے وھاں کی اکثر جگہوں پر ان کی حالت اچھی نہیں تھی، اس کا ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ وہ لوگ ان دور دراز کے ٹاپوؤں

(جزیروں) اور ملکوں میں زیادہ تر «گرمٹیا قلی*» بن کر گئے تھے اور وہاں بس گئے تھے. بہتیروں کی تو ایک دو پشتیں بھی گزر گئی تھیں، ان لوگوں نے ان ملکوں کی آبادی کیلئے بہت کام کیا تھا، یہ لکھنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے بغیر شاید یہ ملک اتنی جلد آباد بھی نہ ہوتے، بہرحال وہ ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے نہیں گئے تھے جو انگریز یا دوسرے یوروپین لوگ وہاں اپنا کاروبار بڑھانا چاہتے تھے. ان کو اس کے لئے مزدوروں کی ضرورت تھی، یہی کاروباری اپنے خرچ سے ان کو لے گئے تھے اور وہ لوگ ان کی شرطوں کو مان کر وہاں گئے تھے. اسی معاهده یا اگریمنٹ کو وہ گرمٹ کہا کرتے تھے اور اس گرمٹ سے بندھے اور پابند لوگوں کو «گرمٹیا» ان کے بعد کہیں کہیں کچھ بیوپاری بھی ہندوستان سے چلے گئے تھے اور کچھ دوسرے لوگ بھی مگر سب کی حالت

---

* انگریزی لفظ اگریمنٹ [AGREEMINT] کا بگڑا ہوا لفظ ہے، جو عام طور پر ان مزدوروں کے لئے استعمال ہوتا تھا جن کو چند شرطوں میں جکڑ کر باہر لے جایا جاتا تھا. [مترجم]

بری تھی، ان کو کسی قسم کا اختیار تو تھا ہی نہیں، ان کا شمار گنواروں میں ہوتا تھا اور ویسا ہی ان کے ساتھ برتاؤ ہوتا تھا، گاندھی جی نے اسی قسم کی بدسلوکی کے خلاف جنوبی افریقہ میں آواز اٹھائی اور ستیہ گرہ کی تھی۔

چارلی اینڈریوز کا دل بہت بڑا تھا سچے عیسائی تھے ہندوستانیوں کیساتھ ان بدسلوکیوں سے انکو تکلیف تھی، انہوں نے اپنے ذمہ یہ کام لے لیا تھا کہ جہاں جہاں غیر ملکوں میں ہندوستانی جا کر بسے اور مصیبتیں اٹھا رہے ہیں وہ وہاں جاتے اور جو کچھ ہوسکتا وہ بطور مدد کے انکے لئے کرتے۔ زیادتی کرنیوالوں کو روکنے کیلئے انگلستان پہونچکر وہاں کے لوگوں کو بیدار کرتے وغیرہ وغیرہ اس سلسلے میں گاندھی جی سے جنوبی افریقہ میں صرف ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ بہت ہی گہرے اور قریبی تعلقات بھی ہوگئے تھے، گاندھی جی پر بھی ان کا کافی اثر تھا اور ہندوستان میں انکی رسائی وائسرائے تک تھی۔ وہ اسی قسم کے کام کیلئے فی جی جارہے تھے اور وہاں جانے سے پہلے گاندھی جی سے صلاح و مشورہ کرنے کیلئے وہ چمپارن آئے ایسے کام میں وہ ہمیشہ گاندھی جی سے رائے

لیکر ھی قدم اٹھایا کرتے تھے۔

اینڈریوز سے ہم لوگوں کی یہ پہلی ملاقات تھی، ایسا انگریز ہم نے کبھی پہلے دیکھا ھی نہیں تھا۔ کپڑے اگرچہ انگریزی کاٹ کے پہنے ہوئے تھے مگر بہت ڈھیلے ڈھالے تھے، دنیا میں کئی بار چکر لگا چکے تھے پھر بھی اتنے سیدھے سادے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسطرح اپنا کام اور سفر کرسکتے ھیں۔ انکے آنے کی خبر شاید پہلے نہیں ملی تھی، اسلئے انکو لینے کیلئے اسٹیشن کوئی نہیں گیا، وہ ریل سے اتر کر ایک یکہ کرایہ کر کے اسٹیشن سے چل دئے۔ «ایکا» ویسا تھا کہ اسکے ایک طرف پیر لٹکا کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اسطرح کے یکے کی سواری کا انکو تجربہ نہیں تھا، اسی لئے پیر لٹکا کر جو بیٹھے تو اسطرح بیٹھے کہ اسکے پہئے سے انکا ایک پیر چھو جاتا تھا اور پہیہ جب گھومتا تو اس سے انکا پیر گھستا تھا مگر انکو اسکی خبر نہ ہوئی۔ قیام گاہ تک پہنچتے پہنچتے، چمڑے کے جوتے کا وہ حصہ جو پہئے سے لگتا تھا، گھستے گھستے کٹ گیا، شاید پیر کی کھال تک پہیہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن انکو اور دوسرے لوگونکو اسوقت معلوم ہوا جب وہ اسپر سے اترے۔

گاندھی جی انکو دیکھکر خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے ہاتھ سے لیمو کاٹ کر اسکا شربت تیار کر کے انکو دیا، یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے گاندھی جی کو ایک پرانے دوست کی خاطر داری کرتے دیکھا. چند دنوں بعد ھی اسطرح کی محبت کا مشاھدہ ھی نہیں بلکہ اسکا تجربہ بھی ہم لوگوں کو ہونے لگا، جبکہ وہ اپنے ھاتھوں سے ھملوگوں کو کھلانے لگے. اینڈریوز وھاں دو تین روز تک ٹھرے، جب انکے جانیکا ذکر ہونے لگا تو ھم لوگوں نے سوچا کہ وہ کچھ دنوں تک اگر رہ جاتے تو اچھا ہوتا ان سے ھملوگوں نے پہلے الگ باتیں کیں اور انکے ٹھرنے پر زور دیا، انہوں نے جواب دیا کہ انہیں «فیجی» جانا ھے جس کیلئے جہاز پر جگہ وغیرہ کا انتظام ہوچکا ھے اور وھاں کام بھی ھے. اس پر بھی ھملوگوں کے اصرار پر وہ ٹھر سکتے ھیں اگر گاندھی جی کی اجازت ہو جائے، چنانچہ انہوں نے ھملوگوں کیطرف سے یہ بات گاندھی جی کیسامنے پیش بھی کی، ھملوگوں نے بھی اسپر زور دیا، لیکن گاندھی جی راضی نہ ہوئے، جب ان سے بہت اصرار کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ آپلوگ جتنا زیادہ زور دے رہے ھیں اتنا ھی ھمارا خیال مضبوط ہوتا

جارہا ہے کہ «اینڈریوز» کو «چمپارن» میں نہ رہکر «فیجی» جانا ہی چاہئے. صاف صاف انہوں نے کہا :—

« میں سمجھ گیا ہونکہ کیوں آپلوگ اتنی ضد کررہے ہیں. آپ لوگوں کے دلمیں جو بات ہے وہ بھی میں نے جان لی ہے اور جس سبب سے آپ انکو روکنا چاہتے ہیں اسی سبب سے میں ان کو جلد سے جلد روانہ کردینا چاہتا ہوں آپ سمجھتے ہین یہاں ہمارا جھگڑا انگریز نیل والوں سے ہے. یہاں کے ضلع مجسٹریٹ و نیز دوسرے بڑے افسر بھی انگریز ہیں، صوبہ کے گورنر اور دوسرے اونچے حاکم تو انگریز ہوتے ہی ہیں. اینڈریوز بھی انگریز ہیں، گورنمنٹ اور انگریزوں پر انکا اثر بھی کافی ہے، گورنمنٹ نے اگر سختی کرنی چاہی تو «اینڈریوز» جیسے انگریز کا ہملوگوں میں موجود ہونا اچھا ہوگا اور اس سے ہمکو مدد ملیگی، آپ کے دلمیں ڈر ہے اور اینڈریوز کا آپ سہارا چاہتے ہیں. میں اس ڈر کو آپ کے دل سے نکالنا چاہتا ہوں. نیل والوں سے اگر جھگڑا ہوگیا تو اسمیں کسی انگریز کی مدد سے خواہ وہ اینڈریوز ہی کیوں نہ ہوں. کہانتک ہم کامیابی حاصل کرسکیں گے؟ ہمکو تو نڈر ہوکر اور اپنی طاقت پر بھروسہ کر

کے کام کرنا ہوگا، اسیوقت کامیاب بھی ہوسکیں گے، اسلئے ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ اینڈریوز کو یہاں سے جانا ہی چاہئے، کل ہی سویرے کی گاڑی سے وہ روانہ ہوجائینگے، «فیجی» کا کام بھی تو ضروری ہے، وہ بھی چھوڑا نہیں جا سکتا»

ہم لوگوں سے یہ سب کچھ کہکر انہوں نے اینڈریوز سے کہا کہ کل سویرے چلے جانے کیلئے تیار ہوجاؤ. ان کو تیار ہونا ہی کیا تھا، وہ تو تیار تھے ہی اس لئے ہملوگوں کو کچھ تھوڑی نا امیدی سی ہوئی، لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ ہمارے دل کی بات کو انہوں نے ٹھیک سمجھ لیا ہے اسکا اثر ہم پر بہت ہوا بے خوفی کا یہ سچا سبق ہمکو اپنے کام کے آغاز ہی میں مل گیا، ہم نے دیکھا کہ ہم کو اس سے فائدہ ہوا ہے. اس طرح روز بروز بے خوفی اور خود اعتمادی کا سبق ہم کو ملنے لگا. دوسرے دن روانہ ہونے سے پہلے اینڈریوز جو اتنے دنوں میں ضلع مجسٹریٹ اور دوسرے حاکموں اور کچھ نیل والوں سے بھی مل چکے تھے. ضلع مجسٹریٹ سے رخصت ہونے گئے. مقدمہ کے فیصلے کی تاریخ کے ابھی ایک، دو دن باقی تھے. لیکن

مجسٹریٹ کے پاس گورنمنٹ کا حکم اسوقت آچکا تھا کہ مقدمہ اٹھا لیا جائے اور گاندھی جی کو جانچ کرنے دیا جائے اسلئے اینڈریوز کو یہ بتادیا اور کہدیا کہ باضابطہ حکم کچھ دیر میں پہنچیگا. اینڈریوز آئے اور روانہ ہونے سے پہلے یہ خوش خبری ہملوگوں کو سنا گئے. یہ خبر مل جانے کے بعد ہم لوگوں کو ان کا جانا کچھ برا نہیں معلوم ہوا. گاندھی جی نے بھی کہا " کہ مجھے بھی کچھ اندازہ ہوگیا تھا. کہ طوفان اوپر ھی اوپر چلا جائیگا. کچھ دیر کے بعد باضابطہ حکم بھی آ گیا. مقدمہ اٹھا لیا گیا. مہاتماجی ضلع مجسٹریٹ سے ملے، اس نے کہدیا کہ آپ جانچ جاری رکھ سکتے ھیں لیکن اسکا خیال رکھئے کہ بدامنی اور هلچل نہ ہونے پائے.

اب ہم لوگ کسانوں کے بیان باضابطہ لکھنے لگے. گاندھی جی نے بہت تاکید کر کے ہملوگوں سے کہا کہ ممکن ھے کہ جو بیان آپ لوگوں کو دئے جائیں ان میں کچھ غلط بھی ہوں یا کچھ مبالغہ سے بھرے ھوں، آپ لوگ تو سب وکیل ھیں خوب جرح کر کے جہانتک آپ کو سچ معلوم ہو وھی لکھئیگا. اسی طریقہ سے ہم بیان لکھنے لگے. یہ خبر فوراً ضلع

میں پھیل گئی. کہ گاندھی جی پر سے مقدمہ اٹھا لیا گیا. اور وہ رعایا کا بیان سن رہے ہیں بہترے کسان آئیںگے سویرے سے شام تک ہم لکھتے رہے تو بھی سب کا بیان ہم نہیں لکھ پاتے تھے

ابھی یہ کام شروع ہی ہوا تھا کہ ہمکو دوسرا سبق ملا. ہم لوگوں کو جانچ کی اجازت تو مل گئی. لیکن ساتھ ہی پولیس کے افسروں کو بھی حکم تھا. کہ سب باتیں دیکھتے سنتے رہیں اور اسکی اطلاع بڑے حاکموں کو دیتے رہیں. اسلئے «سب انسپکٹر» اکثر سارا دن ہملوگوں کے ہی آس پاس رہا کرتا تھا ایک روز بابو دھرنی دھر ایک کمرے میں ایک چوکی پر بیٹھے تھے. انکے چاروں طرف آٹھ دس کسان انکو گھیرے ہوئے کھڑے بیٹھے تھے. یہ انہیں کا بیان لکھ رہے تھے سب انسپکٹر بھی آکر پاس ہی بیٹھ گئے. یہ ان کو اچھا نہ لگا. لیکن کچھ بولے نہیں اور وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ جابیٹھے اور بیان لکھنے لگے. سب انسپکٹر وہاں بھی جا کر بیٹھ گیا وہاں سے اٹھکر وہ تیسری جگہ جابیٹھے. سب انسپکٹر وہاں بھی جاپہنچا. تب ان سے برداشت نہ ہوسکا. انہوں نے اسے جھڑک کر کہا «کہ آپ کیوں اس طرح ہمارے سر پر سوار

رهتے هیں. آپ کو جو کچھ دیکھنا اور سننا هو تو کچھ دور سے دیکھئے اور سنئے» اسپر اس نے وهاں تو صرف یهی کہا «که اسکو تو ایسا هی حکم هے. اسکے بعد اس نے گاندهی جی سے شکایت کی گاندهی جی نے بابو دهرنی دهر اور هم سب کو بلایا. اور هم سے پوچھا که کیا هوا هے. بابو دهرنی دهر نے سب باتیں کہدیں گاندهی جی نے پوچھا که «آپ اکیلے تهے یا آپکے پاس کوئی اور بهی تها» انهوں نے جواب دیا که «هم کو بهت سے کسان گهیرے هوئے تهے. «اسپر گاندهی جی نے پوچھا، که ان کا وهاں جانا آپ کو کیوں ناپسند هوا» انهوں نے جواب دیا که «انکی وجه سے همارے کام میں رکاوٹ پڑتی تهی» گاندهی جی نے پهر پوچھا، که کسانوں کے رهنے سے آپ کے کام میں کوئی رکاوٹ نهیں پڑی. لیکن ان کے وهاں هونے سے رکاوٹ پڑی اس کے معنی تو یه هوئے که یه چونکه پولیس کے آدمی هیں اس لئے رکاوٹ پڑی. ان میں اور دوسرں میں کیوں فرق کیا؟ ان کو بهی کسانوں جیسا کیوں نه سمجها؟ معلوم هوتا هے که پولیس کا ڈر ابهی دل میں هے. اس کو نکالنا چاهئے. هم کچھ چهپکر تو کوئی برا کام نهیں کررهے هیں. پهرچاهے پولیس یا

کوئی بھی وھاں کیوں نہ رھے ڈرنے کی کون سی بات ھے. کسانوں کے دل سے بھی یہ نکال دینا چاھئے. ان کو جو کچھ کہنا ھے پولیس مجسٹریٹ اور نیل والوں کے سامنے بھی نڈر ھوکر ان کو کہنا چاھئے»

بات ان کی ٹھیک تھی. اسوقت پولیس کا ڈر سب کے دلوں میں کچھ نہ کچھ تو رھتا ھی تھا. اور یہ بھی ھمیشہ دماغ میں رھتا تھا. کہ ھماری باتیں اگر پولیس کو معلوم ھوجائینگی. تو نہ معلوم اسکا کیا نتیجہ نکلے گا. اس لئے صرف انقلابی لوگ ھی نہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی پولیس سے بچے ھی رھنا چاھتے تھے. ادھر تو ھم لوگوں کے دل سے پولیس کا ڈر نکالنا اور ادھر پولیس کا انسپکٹر ایسی باتیں سنکر شرمندہ ھوگیا. اس نے سوچا تھا کہ گاندھی جی سے نالش کرکے ان کو ڈانٹ کھلوائیگا جس سے اپنا رعب اور بھی بڑھ جائیگا. گاندھی جی نے ایک طرح ڈانٹا ضرور لیکن اس ڈانٹ نے پولیس انسپکٹر کو یہ بتلا دیا کہ ھم لوگوں کی نظر میں پولیس افسر اور کسان کے درمیان کوئی فرق نہیں ھے اور ھمارا برتاؤ پولیس کے ساتھ ویسا ھی ھونا چاھئے. جیسا کہ معمولی رعایا کے ساتھ ھم کرتے ھیں.

یہاں تو رعب بڑھنے کی بجائے ایک طرح سے بالکل غائب ہوگیا. لیکن وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد کسان کے جمگھٹ میں اس نے پھر بیٹھنا پسند نہیں کیا اور پھر وہاں جا کر نہ بیٹھا. کسانونکی بھیڑ بھی روز بروز بڑھنے لگی، اب ہملوگ کہیں ایک چٹائی پر بیٹھ جاتے اور کسان ہمیں چارونطرف سے گھیر کر بیان لکھانے کیلئے زمین پر بیٹھ جاتے.

گاندھی جی نے ہم‌لوگوں سے کہا کہ «جو رنگ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں کچھ وقت لگیگا، اسلئے اتنا بوجھ گورکھ بابو پر ڈالنا ٹھیک نہیں ہے اسکے علاوہ انکے مکان میں اتنی جگہ بھی نہیں ہے. ایک دوسرا مکان تلاش کر کے ہملوگ اپنا ڈیرہ اسمیں جمائیں. شہر میں لوگوں نے ایک مکان تھوڑی ہی دور پر ڈھونڈھ لیا جس میں ایک چھوٹا سا احاطہ بھی تھا گاندھی جی نے خیال کیا کہ مکان کی صفائی وغیرہ ہو جائے. اور ہم لوگ آج ہی وہاں چلے چلیں. مکان کی صفائی وغیرہ ہوتے ہوتے شام ہوگئی. ہملوگوں نے سوچا کہ آج رات کو نئی جگہ میں نہ جائیں، کل سویرے چلے جائینگے. یہ سوچکر ہم نے اپنے دل ہی دل میں اس رات کو مقام

بدلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا، گاندھی جی سے یہ بات نہیں کہی گئی، کیونکہ ہم سب سوچتے تھے کہ یہ چھوٹی سی بات ھے اس کے متعلق کیا پوچھا جائے۔ رات کے تقریباً آٹھہ نو بجے گئے. اس وقت گاندھی جی نے یہ پوچھا «نئی جگہ مین جانیکی بابت کیا ہوا، اسمیں کب چلنا ھے؟ ان سے کہا گیا کہ صفائی وغیرہ میں دیر ہوجانے کیوجہ سے ہملوگوں نے سوچ لیا ھے کہ کل سویرے لے جائینگے. اس پر انہوں نے کہا «ایسا نہیں ہونا چاہئے جب ایک بار ارادہ کر لیا گیا کہ اس کام کو کرنا ھے تو اس کو کر ھی ڈالنا چاہئے. اس طرح ارادہ بدلنا اچھا نہیں ھے، اور صفائی کی کیا ایسی بات ھے؟ کیا ہم لوگ اپنے رہنے کی جگہ کو بھی خود صاف نہیں کرسکتے. اگر صفائی نہیں بھی ہوئی تو ہم لوگوں کو خود ھی کر لینی چاہئے»

گاندھی جی کا سامان تو بہت مختصر تھا ھی، چھوٹے سے بستر ھی میں سب کپڑے بندھے رہتے تھے، وہ بستر صرف سونے کیوقت ھی کھلتا تھا اور سویرے اٹھ کر اسے خوب قرینے سے باندھکر وہ رکھ دیتے، اس طرح وہ ہمیشہ

بندھا تیار ھی رھتا تھا، دوسرا ایک ٹین کا ڈبہ تھا، وہ یہ باتیں
اپنی پوری کرتے کرتے اٹھ کھڑے ہوئے اور بستر اور ڈبہ
لے کر یہ کہتے ہوئے روانہ ہوگئے کہ میں تو جاتا ہوں
وھیں سوؤنگا، ھملوگ بہت گھبرائے اور پیچھے پیچھے
دوڑ کر انکے ھاتھ سے کسی نے بستر لیا اور کسی نے ڈبہ اور اسکے
بعد ھم نے کہا کہ ھملوگ بھی چلتے ھیں. گاندھی جی تھوڑی دیر
ٹھر گئے ھملوگونکے سامان میں سے، جو رات کیلئے ضروری تھا
اسے الگ کر کے ھملوگ بھی چلے گئے. وھاں پہنچتے ھی گاندھی
جی نے دیکھا کہ برآمدے میں جھاڑو پڑی ھے اسے انھوں نے
فوراً اٹھا لیا اور ایکطرف سے جھاڑنا شروع کردیا یہ دیکھکر ھم
سب حیران رہ گئے. خیر کسیطرح انکے ھاتھ سے جھاڑو لے لی گئی
جہاں تہاں ھملوگوں کے بھی بستر پڑ گئے آخر میں ھملوگوں نے
یہ کیفیت پیش کرنیکی کوشش کی کہ ھم نے یہ سوچا تھا کہ آج رات
نہ آ کر اگر کل سویرے اس جگہ آتے تو کوئی بات نہ بگڑتی
اسلئے جب شام تک ھم یہاں نہ آسکے تو ھم نے آج آنیکا ارادہ
چھوڑ دیا تھا اسپر انھوں نے پھر سمجھا کر ھمارے دل پر اس
بات کو خوب جما دیا کہ جب ایکبار کوئی ارادہ کرلیا جائے تو

اسے چھوڑنا نہیں چاہئے، یہ تیسرا حقیقی سبق تھا، اپنے ہاتھوں اپنی گٹھری اٹھانا۔ آتے ہی جھاڑو دینے لگنا۔ ہم سب کیلئے ایک بالکل نئی بات تھی کیونکہ ہماری زندگی اس دن تک دوسری طرح سے گذرتی تھی، ہم نے ہماری جماعت کے لوگوں میں سے کسی نے کم سے کم بہار میں اسطرح کے کام کبھی نہیں کئے تھے لیکن اس قسم کے حقیقی سبق روز بروز ملتے رہے۔

ہمارا پورے دن کا کام بہت سخت اور محنت کا رہتا مہاتما جی صبح بہت جلد اٹھ جاتے، ان دنوں وہ جماعتی «پرارتھنا» (دعا) نہیں کیا کرتے تھے۔ شاید اکیلے میں کرتے تھے۔ انکا کھانا شروع میں کچھ دنوں تک «چینی بادام» (مونگ پھلی) اور کھجور تھا، جب آم ملنے لگے تب آم بھی کھانے تھے لیکن ابھی کچھ دنوں تک انہوں نے اناج نہیں کھایا، اپنا سب کام اپنے ہی ہاتھ سے وہ کرلیتے، اشنان (غسل) کے بعد کپڑے بھی صاف کرلیتے، سویرے سے شام تک لکھتے پڑھتے اور کسانوں سے ملتے جلتے رہتے تھے، جب کبھی ضرورت ہوتی سرکاری ملازمین سے بھی ملتے، لیکن ابھی نیل والوں سے راہ و رسم نہیں ہوئی تھی ہملوگ بھی خوب سویرے اٹھ کر اشنان (غسل)

اور کچھ ناشتہ کر کے سورج نکلتے نکلتے الگ الگ ایک چٹائی
قلم و کاغذ اور دوات لیکر بیٹھ جاتے اور بیان لکھنے لگتے
اسطرح تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک لکھتے اور پھر
کھانے اور تھوڑی دیر آرام کرنیکے بعد ۱ بجے سے پھر بیٹھ
جاتے اور شام تک لکھتے رہتے. کسانوں کی اتنی بھیڑ ہونے
لگتی کہ ہم جتنے تھے بیان لکھنے کا کام پورا نہیں کر سکتے
تھے اسلئے چند دنوں کے اندر دوسرے اور چند دوست آ گئے
اور اسیطرح کام میں لگ گئے. میرا اندازہ ھے کہ اگر ہم دس
بارہ آدمی اس طرح اپنی دکان لگا لیتے اور دن بھر لکھتے
لکھتے تھک جاتے تو جتنے لوگ آئے ہوئے تھے سب کا
بیان پورا نہیں ہوسکتا اور ان کو دوسرے دن تک کیلئے ٹھرنا
پڑتا شام کو اٹھنے کے پہلے ھملوگ باقی کسانوں کے نام لکھ
لیتے اور دوسرے دن انکے بیان لکھ لینیکے بعد ھی نئے آنیوالونکا
بیان لکھتے، کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ کسانوں کو ایک
روز سے زیادہ انتظار کرنا پڑتا.

موتی ھاری چمپارن ضلع کے دکھنی حصہ کے بیچ میں ھے،
ضلع کے آدھے یا اس سے بھی زیادہ اتری (شمالی) حصے کے بیچ

میں بڑا مقام «بتیا» ھے جہاں بتیا راج کے مہاراج کا محل ھے.
موتی هاری میں بیشتر دکھنی حصہ کے کسان زیادہ آئے اتری حصہ
والے دوری کیوجہ سے بہت نہیں پہونچ سکے پھر بھی جتنے آئے
اتنوں کے بیان سے اتنا تو معلوم هو گیا که وهانکی حالت بھی اتنی
هی خراب ھے اور کچھ جگھونکی تو دکھنی حصہ سے بھی زیادہ
خراب ھے اسلئے یه اراده کیا گیا که کسانونکی سہولت کیلئے اور
وهاں کی حالت خود دیکھنے کیلئے «بتیا» بھی جانا چاھئے تھا.
راجکمار شکل بتیا سے بھی اور دور اترّ کے حصہ کے رھنیوالے
تھے جو «تھارو» لوگونکے رھنے کیوجہ سے «تھاروھٹ» کہلاتا
تھا، وہ تو یہی چاھتے تھے که ادھر بھی گاندھی جی جائیں اسلئے
ارادہ هوا که دو ٹولیونمیں هم بٹ جائیں، ایک ٹولی موتی هاری
میں بیان لکھے اور دوسری بتیامین جاکر رھے، اور هملوگونمیں
ادل بدل بھی هوتا رھے جس سے هر ایک کو سارے ضلع کی
واقفیت هوجائے. هملوگ کسانمیں سے ایک ایک کا بیان لکھتے
اور اسے پورا کرکے گاندھی جی کو دیدیتے وہ اسکو پڑھ لیتے
اور کوئی خاص اهم بیان هوتا تو انکو خاص طور سے بتادیا جاتا
تاکہ اگر کوئی ضروری کارروائی انکو کرنی هو تو کرسکیں.

ایکدن کا ذکر ہے کہ قریب دس بجے دن کیوقت ایک گاؤں کے کسان نے بیان دیا کہ " انکے گاؤں کے کسی آدمی کو ایک نیل والے کے ملازمین نے پکڑ کر پیٹا ہے اس کو لیجا کر مرغی خانہ میں بند کر رکھا ہے مہاتما جی نے اسے پڑھتے ہی ہم میں سے ایک کو حکم دیا کہ سائکل پر جا کر اور تحقیقات کر کے بتاؤ کہ اسمیں کہاں تک سچائی ہے ۔ دوپہر ہی میں وہ وہاں گئے جو پانچ سات میل دور تھا انکے وہاں پہنچتے ہی کچھ لوگ جمع ہو گئے اور کوٹھی والوں کو خبر مل گئی کہ گاندھی جی کا کوئی وکیل آیا ہے ۔ انہوں نے فوراً اس آدمی کو مرغی خانہ سے نکالکر دوسری جگہ چھپا دیا ۔ لیکن چھٹنے کیبعد وہ خود آیا اور اس نے سب حالت بیان کردی یہ تو ایک واقعہ تھا اسطرح کے واقعات اکثر ہوا کرتے کبھی مجسٹریٹ کو لکھنا پڑتا یا ہملوگوں سے کسی کو کہیں جانا پڑتا اسکا اثر یہ ہوتا کہ جو ظلم فوراً ہونیوالا ہوتا وہ رک جاتا، اس سے کسانونکے دلمیں اور بھی بھروسہ اور اعتماد بڑھتا ۔

موتی ہاری میں جب ہملوگ دوسرے مقام پر چلے گئے اور وہاں اپنا انتظام کرنا پڑا تو یہ سوال اٹھا کہ رسوئی (کھانا) کون تیار کرے ؟ اور چوکا برتن کون کرے ؟ ہم بہاریوں کی ایسی

عادت ہے کہ جس سے ہوسکتا ہے وہ نوکر رکھتا ہے جو اسکا
سب کام کرتا ہے اور اسطرح ہم میں سے کئی آدمی اپنے اپنے
نوکر ساتھ لیگئے تھے. پھر بھی انمیں سے کوئی رسوئی (کھانا)
نہیں تیار کرسکتا تھا اسلئے کہ انمیں کوئی برہمن نہیں تھا اور ہم کئی
ذاتو نکے تھے اسلئے ایک برہمن ہی ایسا رسوئیا (کھانا پکانیوالا)
ہوسکتا ہے جسکا پکایا ہوا کھانا ہم سب کھاسکتے تھے. ہم میں
سے اکثر سبھی ذات پات کے ماننیوالے تھے. میں تو ایسے ہی کٹر
لوگونمیں تھا، کچھ بچپن ہی سے گھر کے دستور کا اثر ایسا پڑا
تھا میں گھر سے جب باہر «چھپرا» پٹنہ اور «کلکتہ» وغیرہ
گیا تو بھی اپنی ذات کے یا برہمن رسوئیے کے ہاتھ کی
«کچی رسوئی*» کھایا کرتا تھا، جب ہم لوگ کلکتہ گئے اور
وہاں «ایڈن ہندو ہوٹل» میں رہنے لگے تو وہاں بھی اپنے
لئے الگ رسوئی (کھانے) کا انتظام کرایا، جس میں بہاری
برہمن (رسوئیا پکانیوالا) رکھا گیا وہاں ذات پات کی کچھ ایسی
سختی رہی کہ ہم میں سے ایک دو بہاریوں کو چھوڑ کر

* کچی رسوئی معمولی روٹی یا دال چاول کی تیاری کو کہتے ہیں، اس کے مقابلہ
میں پکی رسوئی تلی ہوئی چیزوں مثلاً پوریاں وغیرہ کو کہتے ہیں. [م]

دوسرے سبھی بہاری بنگالی برہمن کی تیار کی ہوئی کچی رسوئی کھانے کیلئے تیار نہین تھے اس لئے بہاری برہمن تلاش کر کے رسوئیا (کھانا پکانیوالا) رکھا گیا. کلکتہ جانے کے بعد مجھ میں کایستھوں کے کئی اعلی ذات والوں کے فرق کو ترک کر کے ہر ایک کایستھ کے ساتھ چاھے وہ کسی شاخ کا ہو، کھانا کھا لیا کرتا تھا. لیکن کسی دوسری ذات کے آدمی کے ساتھ پندرہ برس تک تعلیم کے زمانہ میں بھی یا اس کے بعد وکالت شروع کرنے پر بھی میں نے بنگالی برہمن تک کی تیار کی ہوئی کچی رسوئی نہیں کھائی ہمارے بہت سے بنگالی دوست تھے. جن میں سے کچھ کے ساتھ بہت گہری دوستی تھی، اور جن کے گھر کے لوگ خود بھی ذات پات کے بہت ماننے والے تھے. ان کے برہمن ہونے کے باوجود بھی میں نے ان کے گھر کی «کچی رسوئی» کبھی نہیں کھائی یہ سب لوگ جانتے تھے، اور جب کبھی کھانے پینے کا موقع آتا تھا تو مجھ جیسے کے لئے وہ پوری اور مٹھائی وغیرہ کا انتظام کرتے تھے. دال بھات (دال چاول) کا نہیں، کیونکہ پوری اور ترکاری پکی

رسوئی سمجھی جاتی ھے اور دال بھات کچی، یہ محاورہ بہار یوپی، راجپوتانہ وغیرہ ھی میں استعمال ہوتا ھے اس لئے «کچی پکی» الفاظ کا مذاق بھی ھوا کرتا، «جل پان» کا لفظ تو مہاتما جی کے لئے ایک بڑے مذاق کا لفظ ہوگیا تھا. اس لفظ کا مطلب تو پانی پینا ھے لیکن بہار میں کچھ کھا کر پانی پیتے ہیں اور جو کچھ کھایا جاتا ھے اسی کو «جلپان» کہتے ہیں اسی لئے جلپان کا مطلب کچھ کھانے کا ھے جس کی مقدار کھانے والے اور کھلانے والے کی خواہش پر منحصر ہوتی ھے وہ اس لئے اکثر مذاق کیا کرتے تھے کہ پانی پینے کے نام پر آپ لوگ اتنا کھا لیا کرتے تھے اور یہ مذاق آخر تک چلتا رہا، جب کبھی ہمارے جیسے کسی بہاری سے کھانے کی بات کرتے تو مہاتما جی لفظ جلپان کہکر ہنسا کرتے.

ذات پات کیوجہ سے اب برھمن رسوئیا (کھانا پکانیوالا) تلاش کرنے کی ضرورت پڑی، مہاتما جی نے کہا کہ اسطرح ذات پات رکھنے سے کام میں رکاوٹ پڑیگی، اور ہم میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ چولھے جلانے پڑیں گے اور خرچ بھی بڑھے گا. پبلک کام اس طرح نہیں چل

سکتے، ہم کو اسے چھوڑنا پڑیگا، آخر جب ہم سب ایک ھی کام میں لگے ہوئے ھیں تو ہم سب کی ایک ذات کیوں نہ سمجھی جائے اس طرح سمجھا کر انہوں نے موتی ھاری ھی میں ذات پات کو توڑوا دیا، ہم میں سے ایک آدمی نے کھانا پکایا اور ہم سب نے مل کر کھایا، اس طرح پہلے پہل کسی دوسری ذات کے آدمی کی تیار کی ہوئی کچی رسوئی میں نے کھائی.

چند دنوں کے بعد ان کو پتہ چلا کہ ھملوگوں کے ساتھہ کئی نوکر ھیں، پہلے تو بہت سے لوگ دن رات گھیرے رہتے تھے اور وہ سب کو کچھ نہ کچھ خدمت کرنے پر تیار رہا کرتے اس لئے اسکا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون نوکر ھے؟ اور کون گاؤں کا آیا ہوا رضا کار (والنٹیر)؟ لیکن میرے پاس ایک موٹا تازہ اور دیکھنے میں عزت دار کسان جیسا آدمی نوکر تھا، وہ موتی ھاری میں بھی تھا اور جب میں بتیا گیا تو وھاں بھی ساتھہ تھا اس وقت مہاتما جی کو خیال ہوا کہ آخر یہ کون آدمی ھے؟ جو موتی ھاری میں بھی تھا اور بتیا میں بھی، اس قدر خدمت کرتا رہتا ھے،

ان کا خیال تھا کہ وہ بھی کوئی رضاکار ہے لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ صرف وہی نہین بلکہ اس قسم کے اور بھی خدمت گذار ہیں جو رضاکار نہیں، اسوقت انہوں نے ہملوگوں سے کہا کہ اسطرح نوکر رکھکر اپنا کام کرانا کسی بھی قومی خادم کیلئے ٹھیک نہیں ہے، قوم کی سیوا کرنے والے کو تو ان سب باتوں میں اپنے اوپر بھروسہ کرنا چاہئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے سب نوکر ہٹا دئے گئے صرف ایک آدمی رکھا گیا، جو چوکا برتن (باورچی خانہ کا کام) کرتا تھا ہملوگون نے بھی آہستہ آہستہ اپنے سب کام خود کرنے سیکھ لئے، اپنا کام کر لینا کچھ اتنا کٹھن نہیں ہوتا ہے، جتنا ہم پہلے سمجھتے تھے ہم نے اپنے لئے یہ قاعدہ بنا لیا تھا کہ سویرے اٹھتے ہی اپنے اپنے بستر ٹھیک طرح سے لپیٹ کر ایک مقررہ جگہ پر رکھ دیتے اس کے بعد صبح کا اشنان کر کے اپنے کپڑے بھی دھو لیتے اور اس کے ساتھ ہی پانی بھی بھر کر رکھ لیتے تاکہ جب ضرورت ہو اسوقت پانی ملجائے، پانی بھرنے کا کام کم کرنا پڑتا کیونکہ کوئی نہ کوئی کسان موجود ہوتا، جو دوڑ کر ہمارے ہاتھوں سے گھڑا لے لیتا اور پانی بھر لاتا، اس

طرح نہانے کا کام بھی جس میں زیادہ پانی لگتا ھے آسانی سے ہو جاتا. چونکہ بہار کے رواج کے مطابق ہم کنویں کے پاس ھی کھلے میدان میں نہا لیا کرتے.

اب شری «کستور با» وھاں آ گئیں تو رسوئی تیار کرنیکا کام گاندھی جی نے انکو ھی سونپ دیا ھمکو یہ بھلا نہیں معلوم ھوا، لیکن گاندھی جی نے نہ مانا اور کہا «اسمیں کوئی حرج نہیں ھے ان کو اسکی عادت ھے. ھاں اگر آپلوگ چاھیں تو انکی مدد کر سکتے ھیں» کرپلانی جی خاصکر انکی مدد کرتے. زیادہ آدمیوں کیوجہ سے جب زیادہ چاول پکانے پڑتے تو برتن «با» کیلئے بھاری ھوتا اسوقت ہم میں سے کوئی جا کر اسکو چولھے پر سے اتار دیا کرتا «با» کے آجانیکے بعد گاندھی جی اناج کھانے لگے اور جب ہم سب ایک ساتھ کھانے بیٹھ جاتے تو مہاتما جی خود اپنی ھاتھوں سے سب کو پروستے (دیتے) کھانیکے بعد ہم سب اپنے اپنے برتن دھو کر اپنے پاس رکھ لیا کرتے، صرف بٹلوئی (دیگچی) وغیرہ دھونے کیلئے ایک نوکر تھا، شام میں قریب ۵ بجے اور دن میں تقریباً گیارہ بجے کھانا ھوا کرتا اور سویرے ھملوگ کچھ جلپان کیا کرتے، شام کے کھانیکے بعد ھملوگ گاندھی جی کیساتھ ٹہلا کرتے اور کچھ دور تک

نکل جاتے، ٹہل کر لوٹنے کے بعد بیان نہیں لکھے جایا کرتے،
گاندھی جی ہم سب کام کرنیوالوں کیساتھ بیٹھکر دن بھر کے کاموں
پر تبادلۂ خیالات کرلیا کرتے اور آئندہ کا پروگرام بھی ٹھیک کرلیتے۔

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد مہاتما جی ہم
میں سے کچھ کو ساتھ لیکر «بتیا» گئے وہاں بھی ہمارا ایک
دفتر کھل گیا تھا، بتیا میں «ہزاری ملکہ» ایک دھرمشالہ ھے۔
اسی کے دو تین کمرے ہم نے لے لئے تھے، اس دھرمشالے میں
اس زمانہ کی پکی چھت تو تھی لیکن اوپر کوئی کمرہ نہیں تھا،
البتہ اوپر جانے کیلئے جو سیڑھیاں تھیں ان پر چھت ہونے کی
وجہ سے تھوڑی سی جگہ یعنی تین فٹ چوڑی اور چھہ فٹ کے
لگ بھگ لمبی مل گئی تھی دن بھر وہ وہیں بیٹھے کام کیا کرتے
اور رات کو وہ اور ہم سب لوگ اوپر کھلی چھت پر سو جاتے،
دن کو ہملوگ نیچے کے کمروں میں رہتے، کمرہ کے اندر
برآمدے میں اور باہر بھی احاطہ میں جہاں کہیں جگہ مل جاتی
اپنی اپنی چٹائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے اور کسانوں کے بیان لکھا
کرتے، بھیڑ اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ دھرمشالہ اور اسکا احاطہ کھچا
کھچ بھرا رہتا کچھ دنوں کے بعد بتیا ھی ہملوگونکا صدر مقام ہوگیا۔

چوتھا باب

نیل والوں کا ایک طریقہ یہ تھا. کہ جب وہ کسی علاقہ کے کسانوں کو سر اٹھاتے دیکھتے تھے تو کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر انہیں دبا دینے کی تدبیریں کرتے، ان کے لئیے بہانہ ڈھونڈھ نکالنا یا پیدا کر لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی ایک طریقہ یہ تھا کہ اپنی کوٹھی کے کسی چھوٹے موٹے مکان میں خود آگ لگوا دیتے اور یہ کہکر کہ کسانوں نے آگ لگا دی ھے خوب لوٹ مار کرتے، پولس سے ظلم کراتے اور جہاں بہت زیادہ سخت مقابلہ ہوتا وھاں تعزیری پولس بٹھوا دیتے، اس طرح کے بیانات ہم لوگوں کے سامنے بہت سے کسانوں نے دئے تھے، لیکن اس کا کوئی ثبوت ملنا مشکل تھا «بتیا» میں ہم لوگوں نے اخباروں میں پڑھا کہ کوٹھی میں آگ لگ گئی ھے،

اور گاندھی جی کے چمپارن آنے سے جو ھل چل مچی ھے
اسکی وجہ سے ھی ایسا ھوا. خبر پڑھتے ھی ھم لوگوں نے
واقعہ کی جانچ کرنی چاھی لیکن یہ واقعہ کچھ دن پہلے کا
تھا اس لئے پورے یقین اور بھروسے کیساتھ کسی ٹھیک نتیجہ
پر نہیں پہنچ سکتے تھے حالانکہ کسان بھی زور دے کر
کہہ رھے تھے کہ کوٹھی والوں نے یہ خود کرایا ھے.
خیر اخباروں میں یہ خبر چھپی. ممکن ھے کہ شاید مقامی
افسروں نے اس کی رپورٹ گورنمنٹ کو بھیجی ھو، مگر ھم
لوگوں کو اس کی خبر نہیں ملی، بیان کافی لکھے جایا
کرتے تھے. شاید دس ہزار تک بیان ھم لکھ چکے تھے اور
اس کے علاوہ بہت سے کاغذ کسانوں نے تلاش کر کے لا
کر دئے تھے سارے ضلع کی کوٹھیوں کی تقریباً سبھی
باتیں ھم لوگوں کو معلوم ھو چکی تھیں گاندھی جی سب ھی
جان گئے تھے اتنے میں ایک روز گورنمنٹ کی طرف سے
ایک خط آ گیا جس میں لکھا تھا کہ گاندھی جی نے بہت
سے کسانوں کے بیان سن لئے، گورنمنٹ سمجھتی ھے کہ انکی
جانچ پوری ھوگئی ھوگی، اس لئے " ریونیو بورڈ " کے ممبر

کو جو بڑے حاکم تھے اور ایک «سینیر سویلین» انگریز افسر تھے، گورنمنٹ رانچی سے پٹنہ بھیج رہی ھے، گاندھی جی ان سے مل کر باتیں کریں اور اپنی جانچ کا ان کو نتیجہ بتائیں. خط پاتے ہی ہم لوگ سمجھ گئے کہ مقامی افسروں کے لکھنے پر ہی شاید گورنمنٹ نے اب جانچ بند کرنی چاہی ھے اور اسی لئے یہ بلاوا ھے گاندھی جی نے ہم لوگوں سے کہا کہ آپ لوگوں کو تو سبھی باتیں معلوم ہوگئیں، اب ایک رپورٹ تیار کیجئے جس میں رعایا کی بھی شکایتیں لکھئے، جن کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی ثبوت موجود ھے. اس کے بعد ہم لوگ گورنمنٹ سے ان شکایتوں کو دور کرنے کے لئے کہیں. ہم لوگ مل کر رپورٹ کی تیاری میں لگ گئے یوں تو ہم لوگوں نے جتنے بیان لکھے تھے ان کو الگ الگ کوٹھی وار چھانٹ رکھا تھا اس طرح یہ معلوم ہوگیا تھا کہ کس کوٹھی کے خلاف شکایت ھے؟ کیونکہ کوٹھیوں کا اپنا اپنا طریقہ الگ الگ تھا، ان کے خلاف جو شکایتیں آئیں ان سے ظلم کے الگ الگ طریقے معلوم ہوگئے ہیں، اسکے

علاوہ یہ بھی پتہ لگ گیا کہ ظلم کے سوا کن کن طریق سے کسانوں کو تکلیف تھی.

گاندھی جی بابو برجکشور پرشاد کے ساتھ پٹنہ گئے، وہاں « ریونیو ممبر » سے ان کی ملاقات ہوئی، ملاقات میں ریونیو ممبر نے اس بات پر زور دیا کہ بیانات کافی لکھے جا چکے ہیں اب گاندھی جی کو تمام شکایتوں کا علم ہوگیا ہے اس لئے وہ جانچ کا کام ختم کریں اور گورنمنٹ کو اپنی جانچ کی رپورٹ دیں تا کہ گورنمنٹ اس پر غور کر سکے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس جانچ کی وجہ سے بہت ہل چل ہے اور نیل والے گھبرا رہے ہیں، اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی ہے. خاص کر انہوں نے یہ کہا کہ گاندھی جی پر گورنمنٹ کو اعتماد ہے اور وہ اگر اکیلے رہیں تو گورنمنٹ کو کوئی خاص اعتراض نہیں ہے، لیکن ان کے ساتھ جو وکیل لوگ کام کر رہے ہیں. وہ پرانے خرافاتی ہنگامے مچانیوالے ہیں جو اپنے فائدے اور اپنی وکالت چلانے کے لئے گاندھی جی کیساتھ ہوگئے ہیں، انکی کوئی ضرورت نہیں ہے، گاندھی جی ان کو ہٹا دیں.

گاندھی جی نے جواب دیا کہ «رپورٹ تو «بتیا» واپس ہو کر فوراً گورنمنٹ کو بھیج دیں گے اور جانچ کے متعلق بھی اب پہلی جیسی پوری تفصیل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مختصر طور پر ایسا خلاصہ لکھ دیا جائے گا جس سے وقت بچے»۔ جہاں تک مددگاروں کے ہٹا دینے کا سوال تھا، انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ «وہ ایسا نہیں کرسکتے» بات چیت کے بعد «ریونیو ممبر» رانچی چلے گئے اور گاندھی جی بتیا واپس آ گئے اور ایک دو روز کے اندر ھی ھم لوگوں نے جو رپورٹ کیلئے مواد تیار کیا تھا اسے دیکھ کر انہوں نے خود ایک چھوٹی سی رپورٹ تیار کرلی جس میں وہ سب شکایتیں آ گئیں جو رعایا کی طرف سے کی گئی تھیں۔ ھم لوگوں نے جو رپورٹ لکھی تھی وہ لمبی تھی کیونکہ ھم نے صرف شکایتیں ھی نہیں لکھی تھیں بلکہ ان کی تائید میں جو ثبوت ھم کو ملے تھے ان کا بھی خلاصہ میں ذکر کر دیا تھا، گاندھی جی نے اسی حصے کو نکال دیا اس میں صرف شکایتوں ھی کو رکھا اور یہ کہا کہ «ان شکایتوں کے ثبوت میں ھمارے پاس کافی مواد موجود

ھے، مددگاروں کے ھٹائے جانے کی تجویز کی انہوں نے زور دار لفظوں میں مخالفت کی، اور لکھا کہ جن لوگوں کے ساتھ ھم اتنے دنوں سے دن رات کام کرتے رھے ھیں ان کو ھم اچھی طرح پہچان گئے ھیں، گورنمنٹ کے کسی افسر کو ان کے جاننے پہچاننے کا اتنا لمبا اور اچھا موقع نہیں ملا ھوگا. اگر گورنمنٹ کا ھم (گاندھی جی) پر بھروسہ ھے تو اس کو یہ بھی بھروسہ کرنا چاھئے کہ ھم اس بات کو سمجھ سکتے ھیں کہ کیسے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاھئے اور جب ھم نے ان کو اپنے ساتھ رکھنا ٹھیک سمجھا ھے تو ھمارا یہ فیصلہ بھی ٹھیک ھوگا». اس کے ساتھ ھی انہوں نے یہ بھی لکھا کہ «یہ سب لوگ سچے اور ایماندار ھیں اپنا سب کاروبار چھوڑ کر اس کام میں لگے ھین جہاں تک ھم نے دیکھا ھے ان کے دل میں گورنمنٹ یا نیل والوں کی طرف سے کسی قسم کی نفرت کا جذبہ نہین ھے، البتہ یہ کسانوں کی تکلیف سے متاثر ھو کر ان کی مدد کرنی چاھتے ھیں، آخر میں انہوں نے کہہ دیا کہ وہ اس پر راضی نہیں ھیں کہ ھم مددگاروں کو

وہاں سے ہٹا دیں۔

اس وقت گاندھی جی کی کچھ نیل والوں سے کافی واقفیت ہو چکی تھی، وہ ان سے کبھی کبھی ملا بھی کرتے تھے، بعض تو ان کو اپنے گھر بھی بلاتے تھے، کچھ ان میں سے یہ کہکر بلاتے تھے کہ ان کے خلاف جو شکایتیں کی گئیں ہیں۔ وہ غلط ہیں اس لئے گاندھی جی اگر ان کے گھر آجائیں تو وہ ثابت کردیں گے کہ وہ سب غلط ہیں، کسانوں سے بھی وہ اس بات کا ثبوت دلوا دینگے جب کبھی وہ نیل والوں کے گھر جاتے تو وہ ان کو اپنی سب باتیں سناتے۔ بتاتے اور دکھاتے کہ انہوں نے کس طرح کھیتی کو ترقی دی ہے۔ ادھر کچھ اور لوگ بھی تھے جو نیل والوں کے اپنے آدمی اور ان کے یہاں نوکر تھے ہم لوگوں کو آکر بہت سی باتیں بتا جایا کرتے۔ کبھی کبھی کچھ کاغذ بھی دے جاتے۔ ایک بار ایک سرکاری ملازم نے ایک رپورٹ کی نقل ہم لوگونکو لا کر دی۔ گاندھی جی کو ہم لوگوں نے وہ نقل لیجا کر دی، پڑھنے سے پہلے جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ کسی سرکاری ملازم نے یہ چھپا کر

ھم کو لا کر دی ھے۔ اور اس کی باضابطہ نقل ھم کو نہیں مل سکتی تو انھوں نے اس کاغذ کو پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کو واپس کر دو، ھم کسی ایسی چیز کو نہیں دیکھنا چاھتے جو ھمارے پاس سیدھی اور سچائی سے نہیں پہنچ سکتی بلکہ چھپا کر لائی گئی ھے۔ ان کے سچے طریقے کا ھم لوگوں کیلئے ایک تجربہ تھا جس کا اثر ھم لوگوں پر بہت ھوا۔

بہت دنوں بعد جب میرے جیل جانے کی نوبت آئی تو میں نے دیکھا کہ بہت سے بھائیوں کے پاس چٹھیاں خفیہ طریقے سے آ جایا کرتی تھیں۔ اخباروں کے متعلق بھی بڑی سختی تھی جیل میں سوائے "ھفتہ وار اسٹیشن مین" کے جو باھر کے ملکوں کیلئے چھپتا تھا۔ دوسرا کوئی اخبار سنۂ ۱۹۳۰ و ۱۹۳٤ کے ستیا گرہ کے موقع پر ھم لوگوں کو نہیں ملا کرتا تھا، لیکن ھم دیکھتے تھے کہ کچھ بھائیوں کے پاس اخبار بھی آ جایا کرتے تھے میرے اوپر اسی واقعہ کا اتنا اثر تھا کہ میں نے کبھی نہ تو بے ضابطہ کوئی خط لیا اور نہ بے ضابطہ کوئی اخبار یا کتاب یا

کوئی اور چیز بھی، گورنمنٹ کا حکم تھا کہ چٹھی، اخبار، کتابیں یا اور کوئی چیز مجسٹریٹ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے معائنہ کرنے والے افسر کے «پاس» کئے بغیر کسی قیدی کو نہ دی جائیں، جیل کے افسر اس حکم کی اس طرح سے تعمیل کرتے کہ «سنسر» کے پاس کئے بغیر کوئی خط نہ دیتے اور «سنسر» کے یہاں سے پاس ہو کر آنے میں بہت دیر لگتی، ان سے جب ہم نے دیر کی شکایت کی تو یہ راستہ نکالا گیا کہ «سنسر» کے پاس بھیجنے کے پہلے خود ہم لوگوں کے پاس لے آتے اور پڑھوا کر واپس لے جاتے، ہم کو دیتے نہیں، اور پھر «سنسر» کے پاس بھیج دیتے جب وہ خط «پاس» ہو کر آتا اس وقت ہم لوگوں کو دے دیا جاتا، اس طرح ہم کو خطوط کی سب باتیں معلوم بھی ہو جاتیں اور سرکاری قانون کی تعمیل بھی ہو جاتی. میں نے اسطرح سے بھی کوئی چٹھی غیرہ نہیں لی

ایک مرتبہ ایک ایسا واقعہ ہوا جس کو یہاں لکھ دینا اچھا ہوگا. کہ جیل کے افسر ہم لوگوں کو خوش رکھنے اور آرام پہونچانے کیلئے بیقرار رہتے ان میں سے ایک نے

مجھ سے کہا کہ آپ لوگ ملک کے کیلئے اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور تکلیف اٹھا رہے ہیں، ہم بھی تو آدمی ہیں، ہمارے دل پر بھی تو اثر ہوتا ہے، ملک کی محبت زیادہ نہیں تو تھوڑی تو ہے، پیٹ کی وجہ سے نوکری کرنی پڑتی ہے۔ اسی پیٹ کی وجہ سے نوکری میں ہم کو ہزاروں بار جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے، فریب کرنا پڑتا ہے۔ چوری کرنی پڑتی ہے، ہم روز ہی یہ سب کچھ کیا کرتے ہیں تو اگر ہزاروں جھوٹ میں دو چار بھی آپ لوگوں کو آرام پہونچانے کیلئے ہم کام میں لائیں تو اس کو ہم اپنے حق میں اچھا سمجھتے ہیں اس لئے آپ ان باتوں کی فکر نہ کریں میں نے اپنے متعلق ان کو جو کچھ سمجھایا اس کو وہ سمجھ گئے اور میرے پاس اس طرح بے ضابطہ چٹھی وغیرہ لیجانیکی کوشش نہیں کی لیکن جو لوگ چاہتے ان کو وہ اوپر لکھے ہوئے طریقہ سے دکھلا دیا کرتے تھے۔

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کتابوں کے متعلق بھی ایسا ہی سخت قاعدہ ہے، ہر وہ کتاب جسکا سیاسیات سے

تعلق ہو، دینے کی ممانعت تھی صرف مذہبی کتابیں، ناول قصے کہانی اور اسی طرح کی ہلکی چیزیں ہی دی جاسکتی تھیں، مگر یہ بھی «سنسر» کے «پاس» کرنے پر، میں نے مہاتما جی کے «نان کواپریشن» سے متعلق تحریکوں کو مضمون واری الگ الگ جمع کر کے ان پر اپنا ایک مقدمہ جن میں ایک ایک مضمون کی سبھی تحریروں کا خلاصہ ہوتا. لکھنے کا ارادہ کیا میں نے «جیلر» سے کہا کہ «ضروری کتابیں خصوصاً مہاتما جی کی تحریروں کے مجموعے جو اس وقت تک کئی جلدوں میں چھپ چکے تھے منگوا لئے جائیں. ان کے علاوہ کچھ دوسری کتابیں «سیاسی معاشیات» کی بھی منگوائیں، جیلر نے کئی کتابیں لا کر میرے پاس رکھدیں، میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کتابیں بغیر پاس کئے ہی آئی ہیں اور نہ یہ جانتا تھا کہ قاعدہ کے مطابق ایک کتاب ہی ایک بار دی جا سکتی تھی، میں اپنے کام میں لگ گیا، اکثر سبھی مضمونوں پر جو مہاتما جی کے اس وقت کے تھے اور جن کو میں مضمون واری تقسیم کر سکتا تھا. میں نے مقدمے لکھ

ڈالے۔ کچھ نوجوان دوستوں نے، جو جیل میں تھے، میرے بتانے کام کے مطابق۔ ان مضمونوں کی نقل کر ڈالی کام بہت حد تک پورا ہو چکا تھا لیکن وہ یکبارگی پورا نہیں ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کتابیں قاعدہ کی رو سے آئی ھیں اس لئے میں نے جیل کے کسی افسر سے چھپانے کی نہ کبھی کوشش کی اور نہ اسکو سوچا، سپرنٹنڈنٹ تو ہفتہ میں ایک بار آتا ھی تھا اور وہ بات چیت کر کے چلا جاتا تھا۔ کتابیں اسکی نظر میں ضرور آجایا کرتی تھیں کیونکہ کبھی کبھی جب وہ پہنچتا تو میں ان کتابوں سے کام لیتا ہوتا لیکن اس نے بھی کبھی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ اس لئے مجھے بھی کبھی شک نہیں ہوا کہ یہ کتابیں بے قاعدہ طریقہ سے آئی ھیں۔ ایک دن خبر آئی کہ محکمہ جیل کا سب سے بڑا افسر (انسپکٹر جنرل) آئیگا۔ جیلر نے آ کر کہا کہ " ان کتابوں کو میں اپنے پاس لیجا کر رکھوں گا۔ اس وقت میرے دل میں شک پیدا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ کتابیں قاعدہ کی رو سے نہیں آئی ھیں؟ اس کے بعد میرے اس کہنے پر کہ آپ نے بے قاعدہ طریقے سے یہ کتابیں

کیوں دیں اس نے اپنا وہ فلسفہ بتایا جو اوپر لکھا گیا. جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم لوگوں کی مدد کیلئے کچھ بے قاعدہ کام کرنا یہاں تک کہ جھوٹ بولنا بھی وہ ایک طرح سے ثواب کا کام سمجھتا تھا، اور اس کو اپنی دوسری غلطیوں کا وہ کفارہ سمجھتا تھا، میں نے کتابیں واپس کردیں اور ان کو دوبارہ دینے کی ممانعت بھی کردی کیونکہ مجھے مہاتما جی کی وہ بات برابر یاد رہی کہ جو کام ہم قاعدہ کی رو سے کھلم کھلا نہیں کرسکتے اس کو چوری چھپے کرنا جھوٹ اور چوری ھے. اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ جو تھوڑا کام باقی رہ گیا تھا وہ پورا نہ ھوا باھر نکلنے پر پھر پورا کرنے کا وقت ھی نہ ملا اور جو کچھ لکھ کر لایا تھا وہ بھی دوسری ستیہ گرہ کے وقت « صداقت آشرم » کے ضبط ہوجانے پر ضائع ھوگیا اور کتاب نہ چھپ سکی.

یہ معاملہ تو ختم ھوگیا، لیکن اس کے ساتھ ھی پڑھنے والوں کی تفریح طبع کیلئے ایک لطیفہ لکھ دینا برا نہ ہوگا. گورنمنٹ کا حکم تھا کہ کوئی سیاست (پولیٹکس) کی کتاب « پاس » نہ کی جائے صرف دل بہلانے والی یا

مذھبی کتابیں دی جائیں، « سنسر » کچھ بہت سمجھدار نہیں تھے اور اگر ھوں بھی تو اتنی کتابوں کے پڑھنے کا ان کے پاس وقت کہاں تھا کیونکہ ھم سیکڑوں کی تعداد میں تھے، اگر کتابیں فی آدمی ایک ایک کر کے بھی دی جاتیں تو « سنسر » کو ھی پڑھکر پاس کرنی پڑتیں اس لئے انہوں نے ایک قاعدہ سا بنا لیا تھا کہ جس کتاب کے نام میں پالیٹکس یا پولیٹکل کا لفظ آجائے تو وہ ھرگز پاس نہ کی جائے، اس طرح پولیٹکل اکانمی (معاشی سیاسیات) کی بھی چھوٹی موٹی کتابیں، جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی ھیں، پاس نہیں ھوتیں لیکن کمیونزم کے متعلق کتابیں جن کے نام میں « پالیٹکس » لفظ نہیں ھوتا تھا، پاس ھوکر چلی آتیں. « اے - بی - سی آف کمیونزم » اور « تھیوری آف لیژر کلاس » جیسی کتابیں پاس ھوگئی تھیں. شاید « سنسر » نے سمجھا کہ پہلی کتاب کوئی پرائمر (بچوں کا قاعدہ) جیسی کتاب ھے اور دوسری میں یہ بتایا گیا ھوگا کہ وقت کس طرح کاٹنا چاھئے یعنی کھیلنے وغیرہ سے اس کا تعلق ھوگا.

اخبار باضابطہ تو نہیں ملتے تھے لیکن جو چاھتا اس

کو باضابطہ مل جایا کرتے۔ خبریں تو سبھی کو مل جایا کرتی تھیں، ان کا راستہ جیل کے افسروں سے مل کر نکالا گیا تھا، جیلر کے دفتر میں ایک صاحب جن کے حافظہ کی قوت بہت تیز تھی روز چلے جاتے، وہاں جیلر وغیرہ جو اپنے لئے اخبار منگاتے وہ ان کو پڑھ کر چلے آتے اور شام کو کھانے کے بعد، کمروں میں بند ہونے کے پہلے ایک جگہ کھڑے ہو جاتے سب لوگ ان کے چاروں طرف آجاتے، وہ سب باتیں زبانی سنا دیتے۔ ہم لوگ کئی «وارڈوں» میں تھے، وہ سبھی وارڈوں میں جا کر اسی طرح خبریں سنا دیتے۔ سرکاری حکم کی تعمیل تو ہوتی کہ اخبار جیل کے اندر نہ جانے پائے لیکن قیدیوں کو اخبار کی سبھی بڑی باتوں کی خبر مل جاتی۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ آدمی اور سرکاری ملازمین بھی ہماری مدد کرنے کو اپنا فرض سمجھتے تھے، کچھ تو ایسی مدد تھی جسے ہم لے بھی سکتے تھے، کیونکہ مہاتما جی کے اصول سے اس میں جھوٹ اور فریب کی بات نہیں تھی۔ اس طرح کا ہر ایک کام سرکاری ملازموں

نے بہت محنت سے کیا۔ ان دنوں مہاتما جی ھندی
تھوڑی بہت جانتے تو تھے، لیکن اتنی نہیں جانتے تھے
کہ ھندی ھی کے ذریعہ سے سب کام کرسکتے یا کراتے،
انہوں نے شروع ھی میں ھم لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ
ھندی میں بات چیت کرنی پسند کرتے ھیں لیکن اس
وقت جبکہ اتنا بڑا کام ھاتھ میں لے لیا ھے تو اس میں
ھندی اور انگریزی کے جھگڑے میں پڑ کر، وہ کام میں
رکاوٹ ڈالنی نہیں چاھتے اسلئے زیدہ تر وہ باتیں بھی انگریزی
ھی میں کرتے، سارے بیان اسی لئے انگریزی میں لکھے
جاتے، جس میں ان کو پڑھ لینے میں آسانی ھو۔ ھم لوگوں
کو خیال ھوا کہ ان بیانوں کی نقل بھی ھو جائے تو اچھا
ھوگا، اتفاق سے «بتیا» نے جس «دھرم شالے» میں ھم
لوگ ٹھرے تھے اسی میں گورنمنٹ کے «سروے سٹلمنٹ
ڈپارٹمنٹ» کے ٹائپ کرنیوالے اھلکار بھی رھا کرتے تھے
گاندھی جی اور ھم لوگوں نے ساتھ ایک ھی مکان میں
انہوں نے ٹھرنا اپنی خوش قسمتی سمجھا، ھم لوگوں سے
انہوں نے کہا بھی کہ دفتر جانے سے پہلے صبح اور

دفتر سے لوٹنے کے بعد ان کو رات بھر فرصت رہتی ھے اگر ہم لوگوں کو ٹائپ کرانا ہو تو وہ خوشی سے کر دیا کریں گے، یہ بات ہم کو بہت پسند آئی. خطوط وغیرہ کے علاوہ سب بیانوں کی نقل تیار کر دینے کو ان سے کہا بڑی محنت سے انہوں نے یہ سب کام خوشی خوشی کر دیا وہ تین چار آدمی تھے، جن میں دو تو بہت ھی ہوشیار اور تیز ٹائپ کرنیوالے تھے. ان کی محنت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ھے کہ جب ہم نے بیان لکھنے بند کئے اس وقت تک تقریباً چوبیس پچیس ہزار کسانوں کے بیانات ہم لوگوں نے لکھ لئے تھے، ان میں سے تقریباً دس ہزار کے پورے بیانات اور باقی کے خلاصے تھے، اس کے علاوہ جب کمیشن مقرر ہوا تو اس کے سامنے پیش ہونیوالے کاغذوں، خطوں وغیرہ کو بھی انہوں نے ھی ٹائپ کیا. ہم لوگ جتنے دن تک چمپارن اس کام میں لگے رہے انہوں نے برابر یہ کام کیا اور یہ انہوں نے شام کے بعد رات کو بہت دیر جاگ کر اور اول وقت بہت سویرے اٹھکر دفتر جانے سے پہلے تک یہ سب کام کیا.

ایک دوسری مثال نیل والوں کے ملازموں کے متعلق دینی اچھی ہوگی، یہ بات مشہور تھی کہ ایک نیل والا بہت بدمزاج اور بدمعاش تھا، جو جاتا اس کو گالیاں دیتا اور مار پیٹ بھی کرتا تھا. اس لئے اس کے غصہ کا شکار صرف اس کے کسان ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے بڑے بڑے ماتحت ملازم بھی اس کا شکار ہو جاتے. مہاتما جی کو اسکی کوٹھی پر جانا تھا. اس کے ملازموں کے دل میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ یہ بدمزاج آدمی ہے، ایسا نہ ہو کہ مہاتما جی کیساتھ بدسلوکی کر بیٹھے اس لئے جب مہاتما جی اس کے کمرے میں ملنے کیلئے گئے تو اس کے اپنے ملازم ادھر ادھر کوئی برآمدہ اور کوئی کونے میں ڈنڈے وغیرہ لیکر چھپے ہوئے انتظار کرتے رہے کہ اگر اس نے کوئی برا برتاؤ کیا تو اپنی نوکری کی پروا نہ کر کے وہیں اس کو خوب ٹھونکیں گے، لیکن اس کی نوبت کبھی آنیوالی تھی ہی نہیں کیونکہ برا برتاؤ کرنا تو اس نیل والے کے خیال میں کبھی نہیں آیا تھا، اس نے مہاتما جی کی بڑی ہی خاطر داری کی، ہم کو یہ سب باتیں ان ملازموں نے

بعد میں بتائیں.

ایک دوسرے نیل والے کا بھی قصہ ھے. اس نے مہاتما جی کو یہ کہکر بلایا کہ ھم آپ کو سب کاغذات دکھا کر ثابت کر دینگے کہ ھمارے خلاف جو شکایتیں کی گئیں ھیں وہ بالکل غلط ھیں. مہاتما جی بہت خوش ھوئے اور اسکے یہاں بیٹھکر کاغذات دیکھنے لگے. وہ جب کسی اھل کار سے کوئی کاغذ مہاتما جی کو دکھانے کیلئے کہتا تو اس کے سامنے ھی اس کے خلاف جانیوالے کاغذوں کو بھی پیش کر دیتے. مہاتما جی اس کے سامنے ھی اس کے کاغذوں کو پڑھتے پڑھتے اسکے مخالف کاغذوں کو بھی جنھیں اسکے اپنے ھی کارندوں نے پیش کردیا تھا، پڑھتے اور ان کے متعلق اس سے پوچھنے لگتے کہ یہ سب باتیں تو آپ کے کاغذوں ھی میں نکل رھی ھیں، اس پر وہ بہت «چڑا» لیکن اس میں مہاتما جی کا تو کوئی قصور تھا ھی نہیں، یہ کچھ بول تو سکتا ھی نہ تھا لیکن بعد میں نہ معلوم اس نے اپنے اھل کار کیساتھ کیا کیا؟ ھم نے سنا ھے کہ اھل کاروں نے یہ کہا کہ «صاحب» نے ان کو پہلے

سے کاغذوں کو چھانٹ کر الگ الگ رکھنے کا حکم تو دیا نہیں تھا اسلئے انہوں نے سب کاغذ ملے جلے ھی پیش کر دئے لیکن شاید انہوں نے الگ رکھے ہوئے کاغذوں کو بھی جان بوجھ کر اکٹھا کر دیا تھا تاکہ پورا بھانڈا پھوٹ جائے اور اسکی سبھی باتیں جھوٹی ثابت ھو جائیں۔

«ریونیو ممبر» نے رپورٹ پا کر گورمنٹ کے حکم سے اسکی نقلیں نیل والوں. سرکاری ملازموں، اور کچھ دوسرے لوگوں کے پاس بھی بھیج دی تھیں، اسکے ساتھ ھی یہ پوچھا بھی تھا کہ گاندھی جی کی شکایتوں کے متعلق آپ کو کیا کہنا ھے؟ ادھر ان کے جواب کا انتظار ھو رہا تھا ادھر گاندھی جی نیل والوں کے یہاں جاتے انکی باتیں سنتے اور مخصوص واقعات کی تحقیقات کرتے یا ھم لوگوں کو تحقیقات کے لئے بھیجتے۔ ھم لوگ بیان بھی لکھتے جاتے. کیونکہ ابھی تک بیان لکھوانے والوں کا تار ٹوٹا نہیں تھا، شاید کسانوں کے دل میں ایسا خیال بیٹھ گیا تھا کہ جس کا بیان نہیں لکھا جائیگا اس کی تکلیف دور نہیں ہوگی۔ ھم لوگوں کو اب بیانوں کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی ان کو

راضی رکھنے کیلئے اس کے بیاں کا خلاصہ لکھ لیا کرتے.
اس طرح ہمارے پاس کام کافی رہتا.

رپورٹ کے جواب میں سرکاری ملازموں اور نیل والوں نے اپنے بیانات گورنمنٹ کو بھیجے. انمیں سے کچھ کی نقلیں ان کے دفتروں کے آدمیوں ہی نے لا کر ہم کو دیدیں یہ دلی خواہش ضرور تھی. کہ ہم ان کے جواب جان لیتے لیکن گاندھی جی کا قاعدہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے سخت تھا اس لئے ہم نے ناجائز طریقوں سے آئے ہوئے کاغذوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا. گاندھی جی کو یہ بات سنا دی گئی لیکن انہوں نے کہا «کہ یہ گناہ بے لذت ہے. کیونکہ یہ کاغذ ہمارے پاس گورنمنٹ ہی بھیج دیگی اور چند دنوں کے بعد ہم کو دیکھنے کیلئے ضرور ملیں گے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوا تو بھی اس کو دیکھنا نہیں چاہئے.

پانچواں باب

کسانوں کی بڑی شکایتیں یہ تھیں کہ ان سے زبردستی نیل کی کھیتی کرائی جاتی ہے. جس سے ان کا بہت سا نقصان ہوتا ہے. اگر کوئی کسان انکار کرتا ہے. یا نیل والے کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ کرتا ہے. تو اس کے ساتھ بہت سختی اور زیادتی کی جاتی ہے. نیل سے بہت سی قسم کے رنگ بن سکتے ہیں. اس لئے یہ بہت منافع کی چیز ہے وہ ایک پودے سے بنتا ہے. پانی میں کچھ عرصہ تک پودے کی پتی اور ڈنٹھل کو رکھ کر انہیں خوب مسل دینے سے سارا رس پانی میں آجاتا ہے. اسوقت پانی کڑھائی میں گرم کرکے سکھا دینے سے رنگ جم جاتا ہے اسکے پودے کھیتوں میں پیدا کرنے کھیتوں سے کاٹ کر پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے حوضوں میں پہنچانے، پیٹنے، چولھے پر چڑھا کر سکھانے وغیرہ کیلئے کافی

مزدور لگتے ھیں. اس کے علاوہ زمین کی ضرورت ھوتی ھے جسکے لئے انہوں نے یہ بندوبست کیا تھا. کہ پہلے تو وھاں کے کچھ زمینداروں سے کسانوں کی طرح زمیں لے لیتے. پھر کھیتوں کے بجائے زمیندار سے سارے گاؤں کا ٹھیکہ لے لیا کرتے اور شرط یہ ھوتی کہ زمیندار کو جو منافع لگان کی شکل میں کسانوں سے ملتا ھے. اسکو وہ خود ھی دیدیا کریں گے. اور گاؤں کا انتظام بھی خود کیا کریں گے. اسطرح جو گاؤں میں غیر آباد زمیں ھوتی اسپر تو انکا اختیار ھو ھی جاتا لیکن اس کے ساتھ ھی کسانوں پر بھی ھر طرح کا اختیار جو کسی زمیندار کا ھوسکتا ھے ان کو مل جاتا زمیندار ادھر لگان کی تحصیل وصول کے جھگڑوں سے بچ جاتا اور ادھر مقررہ وقت پر یکمشت رقم بھی مل جاتی. پھر بھی زمیندار معمولی طور سے گاؤں کا ٹھیکہ نہیں دیتا. کیونکہ غیر آباد زمیں کے آباد کرنے کرانے کے علاوہ اسکو اور بھی کئی طرح کا منافع گاؤں سے ھوتا. اس لئے گاؤں کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے لئے وہ پولیس اور مجسٹریٹ کی مدد سے چھوٹے موٹے زمینداروں پر دباؤ ڈلواتے. اگر کسی گاؤں

کے ایک سے زیادہ زمیندار ہوتے اور ان میں سے ایک بھی کسی وجہ سے اپنے حصہ کا ٹھیکہ دے دیتا. تو دوسرے حصے داروں پر طرح طرح دباؤ ڈلوا کر مثلاً کچہریوںمیں مقدمہ چلا کر یہانتک کہ بلوہ فساد کرا کر انہیں اتنا تنگ کیا جاتا کہ وہ بھی اپنے حصے کا ٹھیکہ دیدیتے. یہ سلسلہ سو برس یا اس سے بھی زیادہ عرصہ سے جاری تھا، اسطرح چاہے زمیندار کوئی بھی ہو، تقریباً سارا ضلع نیل والوں کے قبضہ میں آچکا تھا. انہوں نے آپسمیں مشورہ کرکے سارے ضلع کو بانٹ لیا تھا. تقریباً ستر (۷۰) کوٹھیاں کھول کر ایک ایک کوٹھی کے لئے الگ الگ علاقے قائم کرلئے تھے. بہار میں سرکاری کام کے لئے ضلع کئی حصہ میں بانٹ دیا جاتا ھے. یہ دستور بہت پرانا ھے جو مغلوں یا یوں کہا جائے کہ ہندو راجاؤں کے زمانہ سے ھی چلا آرہا ھے. برطانیہ نے کچھ «ہیر پھیر» کے ساتھ مغلوں کے پرگنوں اور ضلعوں میں صوبہ کو تقسیم کرکے کام چلایا بعد میں بنگال اور بہار وغیرہ میں پولس تھانے اور «سب ڈویژن» بھی قائم ہوئے اس طرح اگر سرکاری دفتر میں دیکھا جائے کہ کس نام

کا گاؤں کہاں ھے تو معلوم ہوگا۔ کہ یہ پرگنہ (پ) تھانہ (تھ) سب ڈویژن (س) اور ضلع (ض) میں ھے۔ چمپارن میں ان چیزوں کے علاوہ یہ بھی مشہور ہوگیا تھا کہ وہ نیل کوٹھی (ن) کے علاقہ میں ھے۔ زمینداروں سے گاؤں کا ٹھیکہ ملنے میں نیل والوں کو یہ ایک سہولت تھی کہ ایک ضلع میں ایک بڑا بتیا" راج جسکی زمینداری میں ضلع کے تقریباً دوتہائی یا اس سے بھی زیادہ گاؤں ھیں دوسرا "رام نگر" راج ھے جسکی زمینداری میں بھی کافی گاؤں ھیں اور ایک چوتھائی یا اس سے بھی بہت کم گاؤں ایسے ھیں جو دوسرے زمینداروں کے ھیں۔ اسلئے بتیا راج اور رام نگر راج کو اپنے ھاتھوں میں لینے کے بعد نیل والوں کو تقریباً سارا ھی ضلع مل گیا۔ پھر دوسرے زمینداروں نے بھی کچھ ڈر کر اور کچھ اپنی سستی اور کاھلی کی وجہ سے زمینداری کے انتظام کے جھگڑے سے بچنے کیلئے نیل والوں کو اپنے اپنے گاؤں کا ٹھیکہ دیدیا۔

جو زمین نیل والوں نے اپنے قبضہ میں کی اس میں وہ خود نیل کی کھیتی کرتے، اپنے ھل اور بیل رکھتے اور

مزدوروں سے کام لیتے اپنی کھیتی کیلئے کچھ تو انہوں نے غیر آباد زمین کو آباد کرکے حاصل کیا. اور کچھ کسانوں کی زمینوں پر کسی نہ کسی طرح قبضہ کرکے زمین لینے میں چاپلوسی، رقم. دھمکی. تفرقہ اندازی غرضکہ ہر قسم کے طریقہ سے کام لیا. کھیت آباد کرانے کیلئے کسانوں کو پکڑ کر ان سے زبردستی کام لیا جاتا، مزدوری بھی برائے نام دی جاتی، اس زمانہ میں زمین کے مقابلہ میں چمپارن کی آبادی بہت کم تھی. اسلئے وہاں کوئی بیکار نہیں رہتا، سبھی لوگ کھیتوں میں اپنا اپنا کام کیا کرتے. انکا کام چھوڑا کر چاہے اس سے کسی کی کھیتی خراب کیوں نہ ہو؟ نیل کے کھیتونمیں کام کرایا جاتا مزدوروں کو اپنے گھر سے کھا کر کام کرنا پڑتا. صرف اتنا ہی نیل والوں کیلئے کافی نہیں تھا بلکہ انہوں نے ہر کسان کو مجبور کیا کہ اسکے پاس جتنی زمین ہو اسکے ایک چوتھائی یا کم سے کم $\frac{۳}{۲۰}$ حصہ میں اسکو نیل کی کھیتی کرنی ہی پڑیگی. نیل والے کے حکم کے مطابق اسکے کھیتوں میں سے جو کھیت نیل کے لئے منتخب کرلئے جاتے انہیں میں اسکو اپنی محنت ہل بیل اور خرچ سے نیل

کی فصل تیار کرنی پڑتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ فصل تیار ہونے پر اسے کاٹ کر کوٹھی تک لیجانا بھی ضروری تھا۔ ان سب کاموں کے لئے وہ فی ایکڑ یا فی بیگھ اسکو کچھ دیا کرتے تھے لیکن وہ اتنا کم ہوا کرتا تھا کہ کسان کو جتنا خرچ کرنا پڑتا اتنا بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح نیل والوں نے ایک قانونی حق حاصل کرلیا تھا۔ کہ وہ کسانوں کو مجبور کر کے ان سے نیل کی کھیتی کرا سکتے ہیں۔ یہ چیز قانون میں لکھ بھی دی گئی تھی۔ کہ جہاں اس طرح مجبور کر کے اپنی مرضی کے مطابق رعایا سے نیل یا دوسری فصل کے پیدا کرنے کا حق انہیں حاصل ہے۔ وہاں وہ چاہیں تو رعایا کو اس پابندی سے آزاد بھی کرسکتے ہیں اور اس کے بدلے میں من مانا معاوضہ لیسکتے ہیں چاہے وہ یکمشت نقد روپیوں کی شکل میں ہو۔ یا اضافہ لگان کی شکل میں جو ان کو سالانہ ملا کرے ان سب باتوں سے کسانوں کو بڑی تکلیف تھی۔ جب کبھی وہ عاجز آکر بلوہ فساد کرتے اسوقت ان کو کچھ دے دیا جاتا، نیل والے جس زمین میں زبردستی نیل کی کھیتی کراتے، اس زمین کا لگان بھی، اسی

کسان کو دینا پڑتا. اس طرح تھوڑا بہت جو کچھ ان کو نیل بونے کے بدلے میں ملتا اسکا بڑا حصہ لگان کے بدلے میں وضع ھوجاتا. ایك بار ان کے بلوہ فساد کا نتیجہ یہ ھوا. کہ گورنمنٹ نے نیل کے کھیت کے لگان کو کسانوں سے وصول کرنا بند کردیا. کسی دوسرے بلوہ کا نتیجہ یہ ھوا کہ نیل کی کھیتی کے بدلے میں جو کچھ ملتا تھا. اسمیں کچھ آنے بڑھا دئے گئے لیکن اتنے اضافہ سے کسانوں کو اطمینان نہیں ھوا. اس طرح ان کے شور و غل کرنے پر چھوٹی موٹی رعائتیں جو شمار کے قابل نہیں ھیں گورنمنٹ انکو دے دیا کرتی تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاتا تھا.

اتفاق ایسا ھوا کہ جرمن کسی دوسری چیز سے رنگ بنانے لگے اسلئے نیل کی قیمت جس سے سب قسم کے رنگ بنا کرتے تھے اتنی گر گئی کہ اتنے ظلم سے پیدا کئے نیل میں بھی اب منافع نہیں رہ گیا. اب نیل والوں کو مجبور ھوکر نیل کی ساری کھیتی چھوڑنی پڑتی ان کا سارا سلسلہ ھی ختم ھو جاتا اور کسانوں کی ساری مصیبتیں خود بخود دور ھو جاتیں. لیکن نیل والے اسکو آسانی سے چھوڑنے والے نہیں تھے. انھوں

نے اس قانون کا سہارا لیا جو انکو یہ حق دیتا تھا۔ اگر وہ کسانوں کو نیل کے کھیت میں مزدوری کرنے سے نجات دیدیتے تو اس معافی کے بدلے میں وہ کسانوں سے نقد روپیہ یا لگان میں من مانا اضافہ کر کے معاوضہ لے سکتے تھے۔ جرمن رنگ کی وجہ سے ان کا جو نقصان ہوتا اسے انہوں نے غریب کسانوں کے سر پر ڈال دیا اور ان سے زبردستی بیس پچیس لاکھ روپیہ نقد وصول کرلئے۔ کئی لاکھ روپیوں کا اضافہ لگان میں بھی کردیا۔ اس کے بدلے میں نیل کی کھیتی کے متعلق معافی نامہ لکھکر دیدیا۔ کوئی کسان نقد رقم دیکر یا لگان میں اضافہ کراکر معافی نامہ نہیں لینا چاھتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نیل کے کام میں اب منافع نہ رھنے کی وجہ سے نیل والے خود اس کام کو چھوڑنے والے ھیں۔ لیکن یہ نقد رقم اور اضافہ کی دستاویزیں ان سے زبردستی لی گئیں۔ گورنمنٹ نے نیل والوں کی مدد کے خیال سے ھر ایک کوٹھی میں دستاویزیں رجسٹری کرنے کیلئے خاص رجسٹرار مقرر کردئے۔ جو نقد یا "شرح بیشی" دینے سے انکار کرتا وہ پیٹا جاتا اس کے گھر اور کھیت لوٹ لئے جاتے اس پر جھوٹے مقدمے

چلائے جاتے۔ اسکو کنوؤں سے پانی لینے کی ممانعت کردی
جاتی اس کے دروازہ پر اچھوتوں کا اس طرح پہرہ بٹھا دیا
جاتا کہ کوئی اندر سے باہر نہ نکل سکے۔ اس کے کھیتوں
میں چرنے کے لئے بڑی تعداد میں مویشی ہانک دئے جاتے
اس کے گھر کے چاروں طرف جو تھوڑی بہت زمین ہوتی
اسکو زبردستی جوت کر اسمیں کچھ نہ کچھ بو دیا جاتا تاکہ
اس سے معلوم ہو کہ خود کسان یا اسکے مویشیوں کی وجہ سے
فصل کو نقصان پہنچا ہے۔ اسکے مویشی پکڑوا کر مویشی خانہ
میں بند کردئے جاتے۔ جہاں سے کافی پیسے دیکر وہ انکو
چھڑا سکتا۔ اسپر جرمانہ کیا جاتا۔ اور بھی کئی قسم کی اس
پر اتنی سختی کی جاتی کہ مجبور ہوکر اسکو «شرح بیشی» مان
لینی پڑتی یا نقد «تاوان» دینا پڑتا اسطرح زبردستی کسانوں کو
بیس پچیس لاکھ روپیہ نقد دیکر اور لگان میں کئی لاکھ
کا اضافہ قبول کرکے نیل کی کھیتی سے معافی لینی پڑتی۔
لیکن جوں ہی یہ کام پورا ہوا کہ ادھر جرمنی کے ساتھ
۱۹۱۴-۱۸ والی لڑائی شروع ہوگئی۔ لہذا جرمن رنگ بند
ہوجانے کی وجہ سے نل کی مانگ پھر بڑھ گئی نیل کی

کھیتی میں پھر منافع نظر آنے لگا نیل والوں نے معافی ناموں کے باوجود پھر زبردستی نیل کی کھیتی کرانی شروع کردی. جہاں نیل کی کھیتی نہیں ہوسکتی تھی ان گاؤں کے کسانوں سے بھی انہوں نے روپیہ وصول کرنے کا دوسرا طریقہ نکالا. کیونکہ وہاں نیل کی کھیتی میں معافی دینے کا کچھ معاملہ ھی نہیں تھا پھر بھی وہاں کے کسان نہیں بچے اور ان سے بھی کافی روپیہ وصول کئے گئے.

ایک اسی ھی نیل والے نے جس کی نیل کی کھیتی بہت کم تھی اور جس نے دوسرے طریقوں سے رقم وصول کی تھی. گاندھی جی سے کہا کہ اس کے کسانوں کو کسی قسم کی شکایت اور تکلیف نہیں ھے. اگر گاندھی جی اسکے علاقہ میں چلیں تو کسان خود آکر سب باتیں کہدیں. گاندھی جی نے دعوت قبول کرلی اور اسکے لئے ایک تاریخ مقرر کردی اسکے خلاف بھی سیکڑوں کسانونکے بیان ہم لوگونکے پاس تھے. اور ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ کسانوں کو کیا شکائتیں تھیں گاندھی جی نے وہاں جانے سے پہلے سب باتیں معلوم کرلیں جہاں جانا تھا وہ جگہ «بتیا» سے چھ یا سات میل دور تھی

گاندھی جی ایسی جگھوں پر اکثر پیدل ھی چلے جایا کرتے تھے سویرے بہت جلد اٹھکر وھاں کے لئے روانہ ہوگئے. میں بھی ان کے ساتھ تھا راستہ میں کچھ کسانوں آئے اور کہنے لگے کہ آج وہ لوگ بڑی مشکل میں پڑگئے. اور ان کے اوپر بڑا ظلم ہورھا ھے دریافت کرنے پر انہوں نے یہ کہا کہ « صاحب » نے کچھ کسانوں کو سکھا پڑھا کر تیار کیا ھے. وہ لوگ گاندھی جی سے کہیں گے کہ ھم لوگ بہت آرام سے ھیں اور ھمارے « صاحب » بہت اچھے آدمی ھیں وغیرہ وغیرہ گاندھی جی نے کہا « کیا ایسا نہیں ھے کیا یہ سب جھوٹ ھے » لوگوں نے بہت زور دیکر کہا یہ بالکل جھوٹ ھے. اسوقت گاندھی جی نے کہا « جو کچھ تم لوگوں کو کہنا ہو وہ « صاحب » کے سامنے ھی کہنا اور سب سچی باتیں بتادینا » اسپر وہ بہت خوش ہوئے. جب ھم لوگ وھاں پہنچے تو کسانوں کی ایک چھوٹی موٹی جماعت وھاں جمع ہوگئی. کچھ دیر کے بعد « صاحب » بھی آگیا. بتیا کے مجسٹریٹ بھی آگئے. اسوقت تک وھاں تقریباً تین چار سو کسان جمع ہوگئے تھے. آھستہ آھستہ لوگوں کی بھیڑ بڑھتی ھی گئی.

«صاحب» نے کہا کہ ھمارے کسانوں کو کوئی تکلیف نہیں ھے. یہاں یہ لوگ آئے ہوئے ھیں آپ خود انسے سن لیجئے یہ کہکر اس نے ایك آدمی کا نام لیکر اسکو پکارا اور کہا کہ تم کو جو کچھ کہنا ہو گاندھی جی سے کہو پھر گاندھی جی سے بھی کہا کہ اس علاقہ میں یہ بہت عزت دار آدمی ھے جسکی سب ھی لوگ عزت کرتے ھیں. وہ ایك بوڑھا آدمی تھا اس نے جوں ھی یہ کہنا شروع کیا کہ «صاحب» کی وجہ سے ھم لوگوں کو ھر طرح کا سکھ ھے کہ دوسرے سب لوگ بول اٹھے کہ یہ جھوٹ بول رھا ھے سب کے سب اس سے کہنے لگے. کہ بوڑھے ہوئے ہو مرنے کا وقت نزدیك ھے کیوں یہ پاپ اپنے سر لے رھے ھو وغیرہ وغیرہ «صاحب» یہ حال دیکھکر کچھ گھبرایا کیونکہ وہ تو یہ سمجھا تھا کہ اس مجمع میں اس کی تعریف کرنے والے آئیں گے کسی شکایت کرنے والے کی آنے اور اسکے سامنے ھی شکایت کرنے کی ھمت نہیں پڑیگی. گاندھی جی نے لوگوں کو منع کرتے ہوئے کہا کہ سب کی بات سنیں گے. بوڑھے کو کہنے دینا چاھئے. جب شکایت کرنے والوں کی باری آئیگی اسوقت

وہ بھی اپنی کہیں گے۔ اسپر لوگوں نے بوڑھے کو کہنے دیا اس نے اور اسکے بعد دوچار اور کسانوں نے اسی طرح سے بیان کیا جب انکا کہنا ختم ہوگیا اسوقت دوسروں کو کہنے کا موقع ملا انہوں نے بھی اپنا بیان شروع کیا ان کی شکایت یہ تھی کہ «صاحب» نے غیر قانونی طریقہ سے لگان میں زبردستی اضافہ کرلیا ھے اس کے لئے انہوں نے ہم لوگوں کے سر زبردستی اتنی زمین تھوپ دی ھے اسپر جتنا وہ اضافہ کرنا چاھتے تھے من مانا لگان لگا دیا ھے۔ کہیں کہیں تو زمین بھی نہیں ھے پھر بھی ایک فرضی زمین کے نام پر لگان قائم کردیا ھے۔ اس پر «صاحب» بول اٹھا کہ یہ تو بالکل غلط باتیں کہہ رھے ھیں۔ میرے پاس کلکتہ کے بڑے بڑے وکیلوں کی رائے موجود ھے اور ان کی رائے لیکر ھی ہم نے یہ سب کچھ کیا ھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جو زمین ہم خود آباد کرتے تھے اور کافی رقم پیدا کرتے تھے ان لوگوں کے بہت زیادہ کہنے پر ہم نے اسی زمین کو اپنی مہربانی سے انہیں دیدیا۔ اسپر کسان چیخ اٹھے اور انہوں کہا کہ ہمیں وہ زمین نہیں چاھئے۔ آپ اضافہ چھوڑ دیجئے

اور اپنی زمین لے لیجئے۔ اسوقت گاندھی جی نے اس سے کہا کہ " آپ کو اسمیں کیا عذر ہوسکتا ہے. اس نے کہا کہ ہم ایسا نہیں کرسکتے. آخر ہمکو بھی تو کسی طرح گزر کرنا ہی ہے گاندھی جی نے کہا کہ "آپ جب خود کہتے ہیں کہ جتنا آپ کو ان سے ملتا ہے. اس سے زیادہ آپ خود پیدا کرسکتے ہیں تو اچھا ہے آپ دونوں خوش رہیں گے آپ زیادہ پیدا کرلیں گے اور انکی شکایت دور ہوجائیگی لیکن وہ اسپر راضی نہ ہوا ادھر کسان شور کرتے رہے کہ ہم لوگ زمین نہیں رکھیں گے ہمارا اضافہ چھڑا دیا جائے.

یہ شاید پہلا ہی موقع ہوگا. جبکہ چمپارن کے کسان کسی صاحب کے سامنے دو بدو اسکی شکایت اور اسکی بات ماننے سے انکار کریں ان میں سے ایک بوڑھا اس مجمع سے باہر نکل کر مجسٹریٹ کی شکایت کرنے لگا اور اس نے کہا کہ یہاں ہم غریبوں کی کوئی نہیں سنتا یہ مجسٹریٹ بیٹھے ہیں یہ بھی انصاف نہیں کرتے. ٹوپی ٹوپی سب ایک ہے. ابھی تھوڑے دن گزرے ہیں کہ صاحب نے ہمارا گھر لٹوا لیا تھا ہمارے چھپر پر جو کدو کی بیل لگی تھی وہ اجاڑ دی گئی.

کھیت چروا دئے گئے اور کیلے کے گچھے گروا دئے گئے۔ یہ سب کچھ ابھی آپ چل کر دیکھ سکتے ھیں۔ جب ھم مجسٹریٹ کے پاس نالش کرنے گئے تو یہی مجسٹریٹ صاحب بید لیکر ھمکو ھی مارنے پر اتر آئے۔ مجسٹریٹ کا چہرہ لال ھوگیا اسنے کہا یہ سب جھوٹ کہتا ھے اس بوڑھے برھمن نے الٹا جواب دیا کہ ھم جھوٹ نہیں کہتے آپ جھوٹ کہہ رھے ھیں۔ مجسٹریٹ اور تو کچھ نہیں کہہ سکا غصہ سے دانت پیستا ھوا فوراً موٹر پر سوار ھوکر چلا گیا۔ ادھر مہاتماجی نے ھم لوگوں سے کہا کہ ان کسانوں میں سے جو لوگ زمین نہیں رکھنا چاھتے ان کے نام لکھ لو جلسہ تو گویا ختم ھوچکا تھا۔ صاحب چلا گیا ھم لوگوں نے سوچا کہ کسانوں سے باضابطہ زمین کا استعفاء لکھوا کر دستخط کرائے جائیں۔ وہ سب اس کیلئے تیار آئے تھے۔ ھم لوگ شام تک اسطرح دستخط کراتے رھے۔ اس کا قانونی نتیجہ یہ ھوتا تھا کہ صاحب کی جو آمدنی اضافہ سے ھوتی تھی۔ وہ یکبارگی رک جاتی۔ ھم لوگوں نے ان سب دستخطی استعفوں کو دوسرے ھی روز بتیاہ پہنچکر صاحب کے پاس بھیجدیا۔ جو کسان وھاں نہیں آئے تھے

وہ «بتیا» آکر استعفاء لکھکر دے گئے جب یہ سب استعفے پہنچ گئے۔ تو اس کے بعد اسکی کئی ہزار روپیے سالانہ کی آمدنی بند ہوگئی۔ مجسٹریٹ نے ایک لمبی رپوٹ گورنمنٹ کو لکھکر بھیجدی۔ جسکا خلاصہ یہ تھا کہ کسانوں میں اتنی بے لگامی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اب صرف «نیل والوں» کو ہی نہیں بلکہ سرکاری افسروں کو بھی کچھ نہیں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ انگریزی راج اٹھ گیا ہے۔ گاندھی جی کے پاس گورنمنٹ کے خلاف بھی نالش کی جاسکتی ہے اور مجسٹریٹ کو بھی ہدایات کرسکتے ہیں اسطرح کی سبھی باتیں دوسرے واقعات خصوصاً اس دن کے واقعہ کی بنیاد پر لکھیں اور گورنمنٹ سے کاروائی کرنیکی سفارش کی۔ اسکا یہ طریقہ تھا کہ گورنمنٹ کو جب وہ کچھ لکھتا تھا۔ جسمیں گاندھی جی کے متعلق کوئی بات ہوتی تھی تو اسکو گاندھی جی کے پاس بھی بھیجدیا کرتا تھا تاکہ اس کے جواب میں اگر انکو کچھ کہنا ہو تو وہ لکھ بھیجیں۔ اور وہ اس جواب کو بھی اپنی رپوٹ کیساتھ گورنمنٹ کے پاس بھیجدے اس مرتبہ بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جو تحریر اس نے بھیجی اسمیں

کچھ ایسی باتیں تھیں جن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ سمجھتا تھا
کہ اس قسم کی رپوٹیں صرف گاندھی جی ھی پڑھتے ھیں ھم
لوگوں میں سے ان کو کوئی نہیں دیکھتا ھے. کیونکہ «راز»
لکھا ھوا ھوتا تھا لیکن جو کچھ بھی چمپارن کے متعلق گاندھی
جی کے پاس گورنمنٹ یا اور کہیں سے آتا تھا اسکو وہ ھم
لوگوں کو بھی دکھادیا کرتے ایسا ھی انہوں نے اس موقعہ پر
بھی کیا اس تحریر کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اسکا یہ
غلط خیال ھے کہ جو کچھ ان کے پاس راز میں بھیجتا ھے اسکو
صرف وھی دیکھتے ھیں اور اس کو ان کے ساتھی نہیں دیکھتے
ھیں انہوں نے صاف کہا کہ پبلک کاموںمیں انہوں نے راز کا
یہ کبھی مطلب نہیں لیا ھے. کہ جن لوگوں کے ساتھ مل کر وہ
کام کررھے ھیں ان سے بھی وہ چیز راز میں رکھی جائے
اسلئے اسطرح کے جتنے کاغذ ابتک آئے ھیں انہوں نے برابر انکو
دکھائے ھیں. اور آئندہ بھی ایسا کرین گے اگر وہ چاھتا ھے
کہ میں ھی کسی چیز کو دیکھوں اور اپنے ساتھیوں کو اسے
نہ دکھاؤں تو ایسی چیز نہ بھیجا کرے.

ھم لوگوں کو یہ بات کچھ کھٹکی. ھم سمجھتے تھے کہ

اسطرح ھی سرکاری باتیں ھمیں معلوم ھو جایا کرتی تھیں لیکن
ابتو معلوم نہیں ھوا کرینگی کیونکہ اب وہ کوئی کاغذ نہیں
بھیجا کریگا اگر صرف گاندھی جی کو ھی سب باتیں معلوم
رھا کرتیں تو اس سے کوئی ھرج نہیں تھا ھملوگوں کو بغیر
بتائے ھوئے بھی جو مناسب سمجھیں گے کاروائی کرسکیں گے
لیکن انہوں نے اپنا خط بھیجنا ضروری بتایا اور کہا کہ پہلے
تو جو اسکے دلمیں غلط فہمی ھے اسکو دور کردینا ضروری
ھے اس کے علاوہ بغیر ھملوگوں کی رائے کے وہ کوئی کام
کرھی کیسے سکتے ھیں؟ اگر ھملوگ سب باتیں نہ جانیں گے
تو پھر رائے کیسے دے سکیں گے ھم نے سمجھ لیا کہ
وہ کتنی گہرائی اور باریکی سے سب باتوں کو دیکھتے ھیں.
اسکو یہ نہیں معلوم تھا کہ ھملوگ سارے کاغذات دیکھتے
ھیں اور اسی بھروسہ پر وہ سب طرح کے کاغذات بھیجا
کرتا تھا گاندھی جی نے سمجھا کہ اگر وہ اس غلط فہمی کو
دور نہیں کرینگے تو ایک قسم کا اسکو دھوکا دینا ھوگا اور
اپنا جھوٹا عمل ھوگا. دوسرے اگر اسکی بات بھی مان لیں
اور وہ آئندہ کاغذ ھمکو نہ دکھائیں تو بھی کسی نہ کسی طرح

بات چیت میں یا ان کی کسی کاروائی سے ہی ہملوگوں کو وہ راز کی بات معلوم ہوئے بغیر نہیں رہیگی. اور اگر ایسا ہوا تو یہ بھی غلط کردار ہوگا. اسلئے انہوں نے اسطرح کی باتوں کو خود بھی نہ جاننا مناسب سمجھا. اسکا نتیجہ کچھ برا نہیں ہوا کیونکہ اسکے بعد بھی پہلے کی طرح راز کے کاغذ آتے رہے اسکا مطلب صرف اتنا ہی سمجھا گیا. کہ گاندھی جی سب لوگوں کو وہ کاغذات نہیں دکھائیں گے. اور اخباروں کو بھی وہ نہیں جانے پائیں گے. ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کیلئے مل جاتا تھا.

ادھر تو مجسٹریٹ نے گورنمنٹ کے پاس رپوٹ بھیجی ادھر ایک نیل والے نے ایک جال پھیلایا. اسکی دو کوٹھیاں تھیں جنکے درمیان چار پانچ میل کا فاصلہ تھا. ایک میں وہ خود رہتا اور دوسری جگہ جو کچھ چھوٹی تھی. وہاں جاکر وہ کچہری کیا کرتا تھا. اور اسکے آس پاس کے گاؤں کا کچھ کام بھی. مندرجہ ذیل واقعہ اسی شاخ کے علاقہ میں ہوا تھا. اس نے رات کو اسمیں آگ لگوا دینے کا ارادہ کیا. پرانے طریقے کے مطابق پولیس اور مجسٹریٹ کی مدد سے لوٹ گھسوٹ مچا کر

وھاں کے کسانوں کو جیل بھجوانے کا بھی ارادہ کیا. اسلئے
اس نے وھاں کے اپنے ایك اھلکار کے ذمه آگ لگانے کا کام
سونپا. ایك نوکر کو ھدایت بھی دی. که آگ لگتے ھی اس
کے پاس آکر رات کو ھی خبر دے. خود اپنی کوٹھی میں جو
چار پانچ میل کے فاصله پر تھی رات کو انتظار کرتا رھا. که
آگ لگنے کی خبر ملتے ھی وہ مجسٹریٹ کے پاس پہنچیگا وھاں
سے پولیس کی مدد لیکر گاؤں میں لوٹ مچادیگا. دن کو ھی
کسانوں نے دیکھا که اس کچھری میں کچھ عجیب کارروائی ھورھی
ھے. اسکے کمرے کی سب چیزیں نکال کر کسی دوسری جگه
ھٹائی جارھی ھیں. کاغذات بھی ھٹائے جارھے ھیں یہانتك که
شیشے کے دروازے بھی نکالے جارھے ھیں. وہ لوگ آگ
لگانے کے طریقه کو جانتے تھے. اسلئے ان کے دل میں یه شك
ھوا که آج کچھ نه کچھ رات کو ھونے والا ھے چنانچه رات
کو ایسا ھی ھوا کچھری کا کچھ حصه جل گیا آگ بجھا دی
گئی کچھ پرانے ردی کاغذ بھی وھاں جلادئے گئے یه ھوتے
ھی راتوں رات وھاں نے کچھ کسان «بتیا» پہنچگئے کچھ رات
باقی تھی که انہوں نے آکر سب باتیں بتادیں اسی وقت گاندھی جی

نے ہم میں سے ایک آدمی کو وہاں جا کر سب چیزوں کا اچھی طرح معائنہ کرنے اور جو کچھ وہاں ہوا اسکا پتہ لگانے کیلئے ادھر بھیجدیا «صاحب» نے جس آدمی کو اپنے پاس خبر دینے کیلئے تعنیات کیا تھا۔ وہ رات کو «صاحب» کے پاس گیا ہی نہیں۔ کیونکہ وہ بھی جانتا تھا کہ خبر دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گاؤں رات ہی رات لوٹ لیا جائیگا اور بہت سے بے قصور لوگ گرفتار ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ مارے جائیں گے سویرا ہوجانے پر وہ «صاحب» کے پاس ایک پرزہ لیکر جو آگ لگانے والوں نے دیا تھا پہنچا اور اسنے صاحب کو دیا اسپر «صاحب» بہت ناراض ہوا۔ اور پوچھنے لگا کہ «رات کو کیوں نہیں لایا» اس نے یہ بہانہ پیش کردیا کہ وہ تو ٹھیک وقت پر آگیا تھا لیکن صاحب کے کتوں نے اسے اندر نہیں گھسنے دیا اسلئے وہ ڈر کے مارے باہر ہی بیٹھا رہا

اس طرح اسکی چال تو ایک طریقہ سے ناکام ہوئی۔ لیکن پھر بھی وہ پولیس اور مجسٹریٹ کے پاس گیا۔ جب وہ پولیس وغیرہ لیکر وہاں پر پہونچے۔ اس وقت تک ہمارے آدمی نے وہاں پہنچکر سب چیزیں دیکھ لیں۔ اور گاندھی جی

کو رپورٹ کردی سب سے زیادہ مذاق کی بات یہ تھی۔ کہ اس نے یہ سوچکر کہ اس آگ لگنے سے کم سے کم نقصان ہو نہ صرف مکان میں رکھے ہوئے سامان کو ھی ہٹوا دیا تھا بلکہ شیشے کے دروازے بھی نکال لئے تھے۔ کیونکہ لڑائی کی وجہ سے ان دنوں شیشہ بہت مہنگا بکتا تھا۔ ہمارے آدمی کو کواڑوں کے قبضے کھول کر نکال لے جانیکے دو ناقابل تردید ثبوت مل گئے۔ غلطی سے کچھ پیچ وہاں پڑے رہ گئے تھے ان کو وہ اٹھا لائے چوکھٹ میں جہاں جہاں قبضے لگے ہوتے تھے وہاں کے قبضے ہٹا دینے سے سادی لکڑی دکھائی دیتی تھی۔ کیونکہ جس رنگ سے چوکھٹ اور کواڑ رنگے گئے تھے وہ قبضوں کے نیچے نہیں پہونچا تھا۔ رپورٹ پا کر گاندھی جی نے فوراً ایک خط مجسٹریٹ کو لکھ بھیجا اور رپورٹ کی نقل بھی بھیج دی انہوں نے صاف لکھ دیا کہ کسان اکثر کہا کرتے تھے کہ کوٹھی والے انکو پھسانے اور ان پر ظلم کرنے کیلئے خود اپنی کوٹھیوں میں آگ لگوا دیا کرتے تھے۔ مگر اسپر وہ یقین نہیں کیا کرتے تھے۔ البتہ اس واقعہ سے اب ان کے دل میں کوئی شک نہیں رہ گیا۔ اب

نیل والوں کو پرانا طریقہ چھوڑنا پڑیگا اس خط کے بعد پولیس یا مجسٹریٹ کچھ بھی نہ کرسکے اور کسانوں کا بھی کچھ نہ بگڑا۔

ظاہر میں تو وہ کچھ نہ بول سکے۔ لیکن اندرونی طور پر گورنمنٹ سے انکی مراسلت جاری تھی۔ اس کے چند دنوں کے بعد رانچی سے ایک خط آیا اسمیں لکھا تھا کہ گاندھی جی کے چمپارن میں آنے سے کسانوں میں بہت ہلچل ھے۔ اسلئے انکا یہاں رھنا گورنمنٹ کے نزدیک مناسب نہیں ھے۔ اور یہ ضروری بھی نہیں ھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی جانچ پوری کرلی ھے۔ اور اپنی رپورٹ بھی گورنمنٹ کے پاس بھیجدی ھے۔ گورنمنٹ بھی اسپر غور کررھی ھے گاندھی جی کو چمپارن سے ھٹانے کے متعلق کوئی کارروائی کرنے سے پہلے "لفٹنٹ گورنر" چاھتے ھیں کہ گاندھی جی ان سے مل لیں۔ اسطرح گاندھی جی رانچی بلالئے گئے۔ مراسلہ وصول ہوتے ھی ھملوگ سمجھ گئے کہ گاندھی جی اب یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ ممکن ھے کہ وہ رانچی ھی میں روک لئے جائیں۔ یا اگر لوٹیں بھی تو چمپارن میں نہ رھنے دیا جائے۔ اسلئے آج پھر وھی حالت پیدا ھوگئی۔

جو چمپارن میں پہنچتے وقت تھی. اتنے دنوں تک ان کے ساتھ رہ کر ان کے کام کا طریقه دیکھ کر اور ان سے دکھنی افریقه کی باتیں سنکر ان کے کام کا طریقه سمجھ لیا تھا. اب هملوگ بھی تیار هو گئے تھے که جو چاهے وہ هو لیکن اس کام کو اب چھوڑنا نہیں هے. گاندھی جی نے کہا که همارے هاتھ میں اب اتنے ثبوت آگئے هیں. که گورنمنٹ کو مجبور هوکر کسانوں کی تکلیفوں کو دور کرنا هی هوگا. اسلئے اگر هم سب کے سب جیل چلے جائیں تو بھی گورنمنٹ کو هملوگوں سے هی باتیں کرنی هونگی.

میں اوپر کہه چکا هوں که هملوگوں نے جتنے بیان لئے تھے ان سب کی ٹائپ کی هوئی کئی کئی نقلیں تیار تھیں. ان میں سے کچھ تو موتی هاری اور «بیتیا» میں رکھ لی گئیں اور کچھ هم نے دوسری جگه محفوظ کردیں. تاکه اگر همارے پاس کی نقلیں برباد بھی هو جائیں. تو بھی همکو وہ مل جائیں. گاندھی جی نے کہا که اسوقت اتنی فکر کی ضرورت نہیں هے. اب هملوگوں کی دو ٹولیاں بنادی گئیں. ایك موتی هاری میں رهنے لگی اور دوسری «بیتیا» میں میں بیتیا میں رها بابو برجکشور. گاندھی جی

کے ساتھ گئے۔ ان سے یہ طے ہوا تھا۔ کہ گاندھی جی کی «لفٹنٹ گورنر» سے ملاقات ہوتے ہی ہملوگوں کو وہ فوراً ضروری تار کے ذریعہ سے اطلاع دے دیں۔ ملاقات کا وقت دس یا گیارہ بجے دن کا تھا اسلئے ہملوگ سمجھتے تھے کہ لفٹنٹ گورنر سے باتیں شاید ایک گھنٹہ تک ہوں۔ اسلئے اگر ایک بجے بھی وہاں سے تار دیدیا جائیگا تو یہاں تین چار بجے تک ہملوگوں کو مل جائیگا۔

ہملوگ اپنی اپنی مقررہ جگہوں پر ٹھہرے رہے مقامی سرکاری ملازمین کا بھی رخ کچھ بدلا ہوا معلوم ہوتا تھا ان کو شاید کچھ پتہ چل گیا تھا کہ گاندھی جی اور ان کے ساتھی وہاں سے ہٹا دئے جائیں گے۔ گاندھی جی اکیلے ہی لفٹنٹ گورنر سے ملنے گئے جہاں یہ دونوں آدمی ٹھہرے تھے۔ وہاں بابو برجکشور انکی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ باتیں کچھ اتنی لمبی چلیں کہ گاندھی جی چار بجے تک بھی واپس نہ ہوئے۔ تو بابو برجکشور کے دلمیں شک ہونے لگا کہ کہیں گاندھی جی بالا ہی بالا کسی دوسری جگہ پہنچا تو نہیں دئے گئے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں لگے ہوئے سڑک کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے

تھے کہ گاندھی جی آئیں یا کوئی خبر دینے والا آئے۔
بہر حال گاندھی جی پانچ بجے لوٹے۔ ان سے معلوم ہوا کہ ابھی باتیں پوری نہیں ہوئی ہیں۔ اسلئے کل پھر ہونگیں۔ اسی مطلب کا ایک تار فوراً وہاں سے انہوں نے بھیجدیا۔ لیکن وہ تار اسی دن ہملوگوں کو نہیں ملا بلکہ دوسرے دن صبح نو بجے کے قریب ملا۔ ہملوگ اپنی اپنی جگہ پر تار کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے بہر حال کوئی خبر دوسرے دن نو بجے کے پہلے نہیں ملی۔ اسوقت ہم لوگوں نے سوچا کہ «[1]دیر آید درست آید» کہاوت کے مطابق کچھ اچھا ہی نتیجہ نکلے گا اسطرح گاندھی جی وہاں ایک دن کے بدلے میں چار دن تک ٹھہرے۔ اور صرف «لفٹنٹ گورنر» ہی سے نہیں بلکہ دوسرے افسروں سے بھی ملتے رہے۔ جب لفٹنٹ گورنر کے دل پر کافی اثر جم گیا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ کچھ کرنا ہوگا۔ اس وقت اس نے گاندھی جی سے کہا کہ ہماری اگزیکٹو کونسل کے دوسرے ممبروں سے بھی مل کر انکو بھی سب باتیں سمجھادیں۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ

---

۱ یہ اس ہندی کہاوت کا «दुत बिलमबी कारजसिद्ध» جو اس کتاب میں ہے صحیح اور با محاورہ ترجمہ ہے

گورنمنٹ ایک کمیشن مقرر کریگی. اس کمیشن کو کسانوں کی شکایتوں کے متعلق جانچ کر کے رپورٹ کرنی ہوگی کہ جو جائز شکایت ہو وہ کس طرح دور کی جائے.

«سر ایدورڈ گیٹ» کی خواہش تھی. کہ گاندھی جی بھی اس کمیشن کے ممبر ہوں. اور سرکاری افسروں کے علاوہ نیل والوں اور زمینداروں کے نمائندے بھی ہوں. سرکاری افسروں نے سول سروس کے ایسے آدمیوں کو چن کر دیا. جنکا اس میں رہنا انکی مخصوص واقفیت اور ان کی قانون دانی کیوجہ سے ضروری سمجھا گیا تھا. کسانوں کا نمایندہ گاندھی جی کے سوا کوئی نہ تھا. گاندھی جی نے کہا میں تو کمیشن کے سامنے کسانوں کی طرف سے ثبوت وغیرہ پیش کرنا چاہتا ہوں. اسلئے ممبر ہوکر میں ایسا نہیں کرسکونگا. اسپر اس نے جواب دیا. کہ جو کچھ آپ کے علم میں آگیا ھے اور جو ثبوت آپ کے پاس ہوں، وہ سب آپ کمیشن کے سامنے ضرور رکھ سکیں گے. ساتھ ھی اس نے یہ بھی کہا کہ بہت برسوں سے جو شکایتیں چلی آرھی ھیں ان کے متعلق سرکاری ملازموں نے وقتاً فوقتاً کیا کیا ھے. اور کیا رپورٹ بھیجی ھے. وہ سب چیزیں

گورنمنٹ کے پاس موجود ہیں۔ لیکن وہ سب «راز» میں ہیں۔ وہ سب چیزیں کمیشن کے سامنے تو رکھی جائیں گی۔ لیکن کسی دوسرے کو دیکھنے کیلئے نہیں مل سکتی ہیں۔ اگر آپ ممبر ہو جائیں۔ تو آپ بھی وہ سب دیکھ اور سمجھ سکیں گے کہ جو شکایت آپ کر رہے ہیں انکی توثیق کسی حد تک سرکاری کاغذوں سے ہو جاتی ہے۔ آخر میں طے ہوا کہ گاندھی جی بھی اسکے ممبر ہونگے۔ وہاں سے گاندھی جی کے روانہ ہونے سے پہلے یہ بات بھی طے ہو گئی کہ جو کچھ بھی وہاں طے پا گیا ہے وہ ابھی «راز» میں رکھا جائیگا۔ اور اسکی اشاعت سب سے پہلے سرکاری اعلامیہ کے ذریعہ ہوگی۔ اسلئے گاندھی جی نے اس چیز کو کسی اخبار والے یا باہر کے آدمی کو جاننے نہیں دیا۔

دوسرے دن جب گاندھی جی پٹنہ پہونچے۔ تو اخباروں کو دیکھکر انہیں تعجب ہوا۔ کہ کمیشن کے تقرر کے متعلق کچھ ادھوری سی خبریں ان میں چھپ گئی ہیں۔ گاندھی جی نے ان کو دیکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ گورنمنٹ کو اسکی اطلاع دیدی۔ کہ ان کو اخباروں میں یہ پڑھکر بہت تعجب

ھوا کیونکہ انکی طرف سے یہ بات کسی پر ظاھر نہیں کی گئی سرکاری اعلامیہ نکلنے میں دو تین دن کی دیر اسوجہ سے ہوئی کہ کمیشن کے ممبروں کی باضابطہ رضامندی مل جانے پر سرکار اعلان کرسکتی تھی. گورنمنٹ کی طرف سے گاندھی جی پر کوئی شک نہیں ھوا. کیونکہ سرکاری دفتر سے راز کی باتیں نکل جایا کرتی تھیں. یا جان بوجھکر پبلک کا اندازہ لینے کے لئے نکلوادی جاتی تھی. ھم کو نہیں معلوم کہ یہ چیز کس ذریعہ سے اخبار والوں کو ملی تھی.

گاندھی جی «بتیا» پہنچ گئے. جس وقت وہ پہنچے. اسی وقت وہ اخبار بھی آئے جن میں یہ خبر چھپی تھی. گاندھی جی نے پہنچتے ھی ھملوگوں کو جتا دیا کہ خبر بے قاعدہ چھپی ھے. اور جب تک یہ سرکاری اعلامیہ میں نہ نکلے. اس وقت تک ھملوگوں کی طرف سے اس طرح کی باتیں کسی سے نہ کہی جائیں. جب وہ مجسٹریٹ سے ملے تو اسکو بہت تعجب ھوا. کیونکہ وہ سمجھے ہوئے تھا. کہ اب گاندھی جی ضلع میں رھنے نہیں پائیں گے. لیکن ایسا نہیں ھوا. وہ صرف لوٹے ھی نہیں بلکہ اپنے ساتھ ایک کمیشن بھی لیتے آئے اور اس کمیشن

کے وہ خود ممبر ہوکر آئے۔ دو تین دن کے بعد جب سرکاری اعلامیہ چھپا۔ تو کسانوں کو بڑی خوشی ہوئی مخالف لوگ کچھ گھبرائے کمیشن اپنا کام تقریباً ایك یا ڈیڑھ مہینہ کے بعد شروع کرنیوالا تھا اس عرصہ میں ہملوگوں کو کچھ ثبوت جمع کرنا یا اظہار لینا نہیں تھا۔ جو کچھ ہمارے پاس آگیا تھا اسی کو اسطریقہ سے سلسلہ وار تیار کرنا تھا۔ کہ وہ کمیشن کے سامنے پیش کیا جاسکے گاندھی جی نے ہملوگوں کو ہدایت کی۔ کہ اپنی وکالتی عقل کو الگ کر کے کاغذوں کے ڈھیر میں سے سب سے زبردست ثبوتوں کو چنکر نکال لو اور کسانونکے جو بیان لکھے گئے ہیں ان میں سے بھی کچھ کو چن کر کچھ ہوشیار کسانوں کو اظہار دینے کیلئے ٹھیك کرلو۔ چند دنوں کے اندر وہ سب راز کے کاغذات چھپے چھپائے گورنمنٹ کی طرف سے آگئے۔ گاندھی جی اور ہملوگوں نے بھی وہ پورے غور سے پڑھ لئے۔ ان کو پڑھ لینے کے بعد گاندھی جی نے کہدیا کہ "اب ہملوگوں کو کوئی خاص ثبوت دینے کی ضرورت نہیں پڑیگی۔ کیونکہ گورنمنٹ کے افسروں نے بھی وقتاً فوقتاً سبھی باتیں مان لی ہیں۔ اس لئے ان افسروں کی رپوٹوں پر ھی کمیشن اپنی رپورٹ تیار کرسکتا ھے۔

اس درمیانی وقت میں ہم لوگ اسی کام میں لگ گئے. ہر ایک مسئلہ پر اپنے نوٹ بھی تیار کرتے رہے. جو ضرورت پڑنے پر کمیشن کے سامنے پیش کئے جاسکیں :-

چھٹا باب

گاندھی جی کے رانچی سے « بتیا » آنے پر شری کستوربا گاندھی ، دیو داس گاندھی اور پربھو داس گاندھی آ گئے . اور یہ سب انکے ساتھ ہی رہنے لگے . انہوں نے ان لوگون کے آنے کے بعد جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے . رسوئی (کھانا) تیار کرنے والے کو ہٹا دیا . اور کہا کہ « کستوربا » ہی رسوئی تیار کیا کرینگی . ہم لوگ اسکو پسند نہیں کرتے تھے . لیکن ہماری کچھ نہ چلی . وہی ہملوگوں کیلئے کھانا بھی پکاتی تھیں . سب سے زیادہ تکلیف اسوقت ہوتی جب چولھے میں لکڑی نہ جلنے کیوجہ سے دھوئیں سے انکی آنکھیں لال ہو جاتیں اور آنسو نکلنے لگتے . ہملوگوں کی باتوں کو گاندھی جی یہ کہکر ٹال دیتے . کہ ان کو اسکی عادت ہے . اور ایسے پبلک کام میں کم سے کم خرچ کرنا چاہئے . نوکر اور باورچی (رسوئیا) کا خرچ جہانتک بچ جائے بچانا چاہئے .

هملوگ سمجھ گئے. کہ گاندھی جی پبلک فنڈ کو کتنی کفایت سے خرچ کرتے ھیں. اور کس طرح ایك ایك پیسہ بچانے کی تدبیر میں لگے رھتے ھیں اس طرح سے ھم نے دیکھا جہاں پوسٹ کارڈ سے کام چل سکتا تھا. وھاں کبھی وہ زیادہ پیسے خرچ کر کے لفافہ نہیں بھیجتے تھے. کاغذ کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کو بھی برباد نہیں ھونے دیتے. شاید یہ بہت سے لوگوں کو معلوم نہوگا کہ ان کی بہت سی اھم تحریرین اور اسکے علاوہ کانگریس اور دوسری انجمنوں کی بہت سی اھم تجویزیں ایسے ھی کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھی گئی ھیں. جن کو معمولی طور سے لوگ ردی کی ٹوکری میں پھینك دیا کرتے ھیں. لفافوں کے اندر اور تاروں کی پشت کے سادے حصہ اور دوسرے ایك ھی طرف لکھے ھوے کاغذوں کا خالی حصہ وہ اسی زمانہ سے آخر عمر تك برابر لکھنے کے کام میں لاتے رھے. وھاں ھمیں بھی سیکھنے کو ملا کہ پبلك کاموں میں پیسے کے خرچ کے متعلق کتنی احتیاط سے کام لینا چاھئے. چمپارن میں جو کچھ خرچ ھوا وہ گاندھی جی نے ھی اپنے دوستوں سے لیکر دیا. ان دوستوںمیں رنگوں کے «ڈاکٹر پی. جے. مہتا» بڑے آدمیوں میں سے تھے

ہملوگوں کو چندہ جمع کرنے کی نہ ضرورت پڑی اور نہ انہوں نے اسکی اجازت دی۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ہملوگوں کے ساتھ جو نوکر تھے وہ ایک ایک کر کے ہٹادئے گئے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مجھے کسی کام سے ایک دن کے لئے پٹنہ جانا پڑا۔ میرے پاس ایک چھوٹا ڈبہ تھا۔ جس میں سفر میں کچھ کھانے کے لئے لے جایا کرتا تھا۔ وہ چمپارن ساتھ آگیا تھا۔ لیکن کبھی ضرورت نہ پڑنے کی وجہ سے یونہیں پڑے پڑے بہت میلا ہوگیا تھا۔ پٹنہ جانے کے لئے کنویں پر بیٹھ کر میں اسے صاف کر رہا تھا۔ گاندھی جی ادھر آ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی ہنس پڑے اور بولے کہ « بڑی خوشی ہوئی کہ پٹنہ ہائی کورٹ کے وکیل سے ہم نے برتن منجوایا، جو لوگ وہاں تھے وہ سب کھکھلا کر ہنس پڑے گاندھی جی نے دکھنی افریقہ میں خود پاخانہ صاف کیا تھا۔ ہملوگوں کے لئے چمپارن میں وہ نوبت نہیں آئی وہ جانتے تھے کہ آہستہ آہستہ سے ہی کچی لکڑی مڑ سکتی ہے۔ زیادہ زور لگانے سے ٹوٹ جانیکا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے چمپارن میں انہوں نے اپنا سارا پروگرام ہملوگوں کے سامنے نہیں رکھا۔ صرف

چمپارن هی کا معامله رکها. اور اس کیلئے جو کچھ ضروری تها. وهی هم سے کرایا اس سے زیاده نهیں.

چمپارن میں هملوگ ابهی کهادی نهیں پهنتے تهے یهانتک که اس کا نام بهی نهیں جانتے تهے. اگرچه هم میں سے کچھ لوگ ایسے بهی تهے. جو سودیشی کا استعمال پهلے هی سے کیا کرتے تهے. میں تو سنهٔ ۱۸۹۸ء سے هی سودیشی کا استعمال کرتا تها. کیونکه میرے بڑے بهائی مهندر پرشاد جب پریاگ(الهآباد)پڑهنے گئے. تو وهاں انهوں نے سودیشی کپڑوں کا استعمال شروع کیا. اور انکی هی دیکها دیکهی هم نے بهی سودیشی کپڑوں تك هی یه طریقه نهیں رها. بلکه دوسری چیزیں بهی اگر سودیشی مل جاتی تهیں تو هم انهیں کو لیتے. لیکن اگر کوئی ایسی چیز هوتی جو سودیشی نه هوتی پهر اسکا استعمال هی جهانتك هوسکتا چهوڑ دیتا. هاں ایسی چیزیں جن کے بغیر کام هی نهیں چل سکتا تها تو پهر بدیشی بهی لے لیتے جیسے گهڑی یا دوا وغیره. میری یه بچپن کی عادت ایك طرح سے آجتك چلی آرهی هے. یه ماننا پڑیگا که ان دنوں کے مقابله میں اب بدیشی چیزین بهت زیاده استعمال کرتا هوں. میں جب تك پڑهتا رها کسی امتحان میں. میں نے

بدیسی قلم یا بدیسی نب کا استعمال نہیں کیا. سبھی امتحانوں کو دیسی ھی نب کے ذریعہ چاھے وہ کتنی ھی خراب کیوں نہ ھو پاس کیا. اب تو فاؤنٹنپن اور اسکی روشنائی بھی بدیسی استعمال کرتا ھوں. کپڑا میں نے اس وقت سے آج تک ایک موقع کے علاوہ کبھی نہ تو بدیسی استعمال کیا اور نہ خریدا. وہ موقع اس وقت کا تھا جب دل میں ولایت کا سودا سمایا ھوا تھا. میں نے وھاں کے لئے جو کپڑے بنائے ان میں دیسی اور بدیسی کا لحاظ نہیں رکھا. یہ سنۂ ۱۹۰۶ کی باتیں ھیں جب سے گاندھی جی نے کھادی چلائی. اسوقت سے کھادی کے سوا اور وسرا دیسی کپڑا نہیں لیا. اس میں ھمارے بھائی صاحب بڑے پکے تھے انہیں سے مجھے یہ سبق ملا تھا. گاندھی جی سے اکثر ھملوگوں کی باتیں ھوا کرتیں. جنکا اثر برابر پڑتا گیا. اس زمانہ میں شریمتی مسز بیسنٹ کے «ھوم رول» کی تحریک خوب زوروں سے چل رھی تھی. ھملوگوں کے سبھی ساتھی جو پبلک کاموں میں دلچسپی رکھتے تھے. اور چمپارن نہیں آئے تھے اسی تحریک میں لگ گئے. گاندھی جی نے ھملوگوں کو منع کردیا تھا کہ جب تک تم لوگ اس کام میں ھو. کسی اور کام میں ھاتھ

مت ڈالنا. اسلئے ھملوگ جتنے دنوں تک وہاں رہے اور وہ آٹھ دس مہینے کا عرصہ تھا. ھم میں سے کسی نے کہیں بھی کوئی تقریر نہیں کی. خود گاندھی جی بھی دو موقعوں کے علاوہ (جو مجھے یاد ھیں) کسی سبھا میں شریک نہ ہوئے. ایک جلسہ تو «آنجہانی دادا بھائی نوروجی» کی وفات پر اظہار غم کے لئے کیا گیا تھا. اور دوسرے «گئو رکھشا سبھا» کے سالانہ جلسہ کے وقت صرف اتنا ھی نہیں کیا کہ ھملوگ اور گاندھی جی کسی سیاسی مسئلہ پر تقریر نہیں کرتے تھے. بلکہ چمپارن کے متعلق بھی کسی نے کہیں کوئی تقریر نہیں کی. اور نہ اس طرح کا کوئی مضمون کبھی اخباروں کو بھیجا. ھملوگوں کو کبھی کبھی یہ بات ذرا تکلیف دیتی تھی. جب ھم نے «ھوم رول لیگ» میں شریک ھونیکے لئے ان سے کہا. تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ تملوگ ھوم رول کا سب سے بڑا کام یہیں کر رہے ھو. اسلئے اگر کسی دوسری سبھا میں شریک نہیں ھوسکتے ھو. تو اسکی پرواہ مت کرو کیونکہ آگے چلکر دیکھوگے. کہ یہ کام کسی اور کام سے کم اہم نہیں ھوگا. ھم نے ان کی بات مان لی. اگرچہ کبھی کبھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی. کہ جو کام ھم کر رہے ھیں

اس سے "ھوم رول" کا کیا تعلق ھے. یہ میں ابتدا کی بات لکھ رھا ھوں. تھوڑے ھی دنوں میں ھم نے تجربہ سے سمجھ لیا کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف صحیح ھے.

ایکبار میں گاندھی جی کے ساتھ کسی گاؤں سے آرھا تھا. راستہ میں میں نے ان سے پوچھا کہ آپ سارے ملک میں گھوم آئے ھیں. آپ نے کس صوبہ کے لوگوں کو پبلک کام کے لئے سب سے اچھا پایا انہوں نے کہا کہ "دکھن کے لوگ جذباتی ھیں اور ھوشیار ھیں. بنگال کے لوگ بہت جذباتی ھیں. اور ان میں ایثار و قربانی کی بہت قوت ھے. اور انہوں نے اسکو کیا بھی بہت ھے. لیکن جنتا کی خدمت کرنے والے کے لئے "پونا" ھی متبرک مقام (تیرتھ استھان) ھے وھاں جتنی پبلک انجمنیں کام کرنے والوں کے ایثار اور قربانی پر پورے اطمینان سے چل رھی ھیں. اتنی شاید کسی دوسرے مقام پر نہیں ھیں. وھاں ایسے بہت سے لوگ ھیں جنہوں نے اپنی زندگی کو ملک کی خدمت کیلئے وقف کردیا ھے اور وہ اپنے عہد کو بہت ھی مضبوطی سے نباہ رھے ھیں اسلئے میں اسکو تیرتھ استھان مانتا ھوں.

مجھے بھی اسکا کچھ حال معلوم تھا. سنہ ۱۹۱۰ء میں شری

گھوکھلے سے میری ملاقات ہوئی. اسوقت انہوں نے مجھے «انجمن خادم ھند» (سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی) میں شریک ہونے کو کہا. لیکن گاندھی جی کے کہنے پر اب یہ میری خواھش ھے کہ ایکبار وھاں جا کر ان انجمنوں کو دیکھوں.

ھم لوگ آپس میں باتیں کیا کرتے تھے. کہ ھمارا صوبہ اور صوبوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ھے. اس وقت شاید ھی ایسے لوگ بہار میں ھوں کہ جو اپنا سارا وقت دیکر کسی پبلك انجمن یا ملك کا کام کر رھے ھوں. ھملوگوں کو خیال ھوا کہ کوئی ایسی سوسائٹی بہار میں قائم کی جائے جسکا مقصد صرف خدمت ملك ھو. بابو برجکشور پرشاد جی ھملوگوں کے «نیتا» اور ھادی تھے ھملوگوں نے سنا تہا کہ «پونا» میں فرگوسن کالج کے تمام اساتذہ ۷۵ روپیہ ماھوار پر کام کرتے ھیں شری گھوکھلے نے بیس برس کا عہد کرکے ۷۵ روپیہ پر ھی کام کیا تھا. اسی طرح ان دنوں ڈاکٹر پرانچپے. جو انگلستان کے بڑے بڑے امتحانوں کو پاس کرکے آئے تھے. ۷۵ روپیہ ماھوار پر ھی وھاں کام کر رھے تھے. ھملوگونکا خیال ھوا کہ ایسا ھی ایك کالج بہار میں کھولا جائے. اس سے یہ فائدہ ھوگا. کہ اس کالج

کے پروفیسر اپنی زندگی نوجوانوںکے سامنے ایثار اور قربانی کی مثال میں پیش کرسکیں گے. جس سے سارے صوبہ میں بیداری پیدا ہوگی. بابو برجکشور پرشاد بھی گاندھی جی کی طرح جو کام اٹھاتے تھے اس کو جلد سے جلد پورا کرنا چاہتے تھے. جب یہ بات چلی تو انہوں نے خود ایسی سوسائٹی میں اپنی وکالت چھوڑ کر شریك ہونے کا ارادہ ظاہر کیا. ہملوگوں سے پوچھ پوچھ کر جو لوگ راضی ہوئے ان کے نام لکھ لئے. کچھ لوگوں سے گفتگو کرکے رقم کے بھی وعدے لئے. جہانتك اب مجھے یاد ہے. سات آٹھ ہزار روپیے ہمکو نقد مل گئے. اسوقت تك ہملوگوں کا خیال قومی تعلیم کی طرف نہیں گیا تھا. اگرچہ ہم نے خود تقسیم بنگال کی تحریك کے وقت جب کلکتہ میں میں نے قومی تعلیمی ادارے دیکھے تھے. «گرو کل» بھی کئی برس سے چل رہے تھے. پھر بھی ہم نے گورنمنٹ سے تعلق رکھنے والے کالج کھولنے کا ارادہ کیا تھا. مہاتماجی سے جب یہ بات کہی گئی. تو انہوں نے سوسائٹی بنانے کا خیال تو پسند کیا. لیکن کالج کھولنے کا پسند نہیں کیا. اس لئے وہ تجویز وہاں کی وہیں رہ گئی.

کمیشن کا کام بتیا میں شروع ہوا. کچھ سرکاری اور کچھ نیل والوں نے اپنے اپنے تحریری بیانات دئے. اور انکے زبانی بیان بھی لئے گئے. کمیشن نے موتی هاری میں بھی کئی روز تک بیٹھک کی. اسکے ممبروں نے کئی نیل والوں کے پاس جاکر انکے اظہار لئے. اور انکے کاغذات بھی دیکھے. تقریباً ایک طرف سے انہوں نے سارے ضلع کا دورہ کرلیا. کسانوں کی طرف سے بھی بیانات اور اظہار ہوئے. ہم لوگوں کے پاس جو کاغذات تھے انمیں سے جو ٹھیک معلوم ہوئے. وهی منتخب کرکے پیش کئے گئے، لیکن جیسا کہ گاندھی جی کا خیال تھا، کسانوں کی طرف سے ثبوت پیش کرنیکی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوئی، کیونکہ سرکاری افسروں کی وہ راز کی رپوٹیں جو وقتاً فوقتاً پیش ہوئی تھیں وهی کافی سمجھی جاتی تھیں اظہار کا کام ختم ہو جانے پر رپورٹ لکھنیکا وقت آیا « سرایڈورڈ گیٹ » نے مہاتماجی سے کہدیا کہ اگر کمیشن اتفاق رائے سے رپورٹ دیگا. تو گورنمنٹ اس رپورٹ پر آسانی سے کام کرسکیگی. لیکن اگر ممبروں نے اختلاف رائے ظاہر کیا تو گورنمنٹ کو بھی اس رپورٹ کی بنیاد پر کام کرنے میں دشواری ہوگی. اسلئے

گاندھی جی کی یہ تجویز تھی۔ کہ جہانتک ممکن ہو متفقہ رپورٹ تیار کی جائے۔ اسمیں دقتیں بہت تھیں۔ کیا نیل والونکے نمایندے اور گاندھی جی ایک رائے ہو سکتے تھے؟ کیا ان کی شکایتوں کو جو نیل والوں کے خلاف کی گئی تھیں۔ انکا نمایندہ مان لیگا؟ اگر ایسا ہوگا تو کیا گاندھی جی ان شکایتوں کو جن کو وہ صحیح جانتے تھے۔ غلط کہکر نیل والوں کے نمایندے کے ہم خیال ہوجائیں گے؟ جن برائیوں کو دور کرنا تھا۔ ان میں سب سے بڑھکر یہ تھیں "تین کٹھیا" کا رواج، اضافہ لگان اور تاوان کے نام سے کسانوں سے زبردستی روپے وصول کرنا۔ اب جبکہ جرمن لڑائی کی وجہ سے نیل کی کھیتی سے پھر منافع ہونے لگا تھا۔ تو کیا نیل والے اسکو اب چھوڑ دینگے۔ انہوں نے لگان میں اضافہ کرکے جو لاکھوں روپے کی آمدنی بڑھائی تھی کیا وہ اسے چھوڑ دینے پر راضی ہونگے؟ کیا وہ تاوان کے روپے واپس کر دینگے؟ یہ سب کچھ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس کمیشن کا قائم ہونا ہی بیکار تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ سرکاری افسروں کا رخ کیا ہوگا؟ البتہ زمینداروں کے نمایندے گاندھی جی کے ہم خیال ہوسکتے تھے۔

گاندھی جی نے شروع ھی میں ایك بہت بڑے جھگڑے کے سبب کو دور کردیا تھا۔ اور کہدیا تھا کہ ھملوگ اپنی سفارشوں کے متعلق اگر ایك رائے ھو جائیں گے تو میں اس بات پر زور نہیں دونگا کہ نیل والوں کی ظلم و زیادتی کی جو شکایتیں کی گئیں ان پر بھی کمیشن اپنی رائے دے۔ اگر ان کے کرتوتوں کے کارنامے کی رپورٹ لکھی جاتی۔ تو اسمیں کوئی شك نہیں تھا کہ نیل والوں کے خلاف سبھی باتوں کو ماننا پڑتا۔ اگر کمیشن کے سب ممبر ایك رائے نہیں ھوسکتے۔ اور گاندھی جی کو اپنی رائے الگ لکھ کر دینی پڑتی تو اتنا زبردست اور ناقابل تردید فیصلہ وہ لکھ دیتے کہ کسی کو چون چرا کرنیکی ھمت نہیں ھوسکتی تھی۔ اگر کمیشن کے دوسرے ممبر اور کچھ لکھنا چاھتے۔ تو ان کی ساری باتیں سرکاری افسروں کی غیر جانبدارنہ رپوٹوں سے ھی کاٹی جاسکتی تھیں۔ ان کے اس مشورہ کو دوسرے ممبروں اور نیل والوں کے نمایندے نے بھی خوشی سے مان لیا۔ کیونکہ اس سے وہ ایك سخت مصیبت سے بچ جاتے تھے۔ گاندھی جی نے یہ مشورہ اسلئے دیا تھا کہ وہ اس بات کو جانتے تھے۔ کہ جو زیادتی اور اور ظلم ابتك ھوچکے ھیں۔ وہ تو اب واپس

نہیں ہوسکتے تھے. اور اگر اب آئندہ کیلئے انکا ہونا بند ہو جائیگا، تو ان کے لکھنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں ہے، گاندھی جی ہملوگوں سے، سرکاری افسروں و نیز نیل والوں سے کہا کرتے تھے کہ وہ نیل والوں کے دشمن نہیں ہیں، ان کیلئے وہ کوئی برائی نہیں چاہتے، مگر ساتھ ھی جو ظلم وہ کسانوں پر کیا کرتے ہیں. وہ سب بند ہوجانے چاہئیں. ظلم کے بند ہو جانے سے اگر انکا نقصان ہوتا ہے تو اسے برداشت کرنا چاہئے چونکہ وہ انکی برائی نہیں چاہتے تھے. اسلئے اگر رپورٹ کے ذریعہ کسانوں کی بھلائی ہوجائے تو نیل والوں کے خلاف جو شکایتیں تھیں. انکا لکھنا فضول تھا. اس تجویز کے پیش کرنے میں انہوں نے اپنی «اهنسا» کی روشنی سے کام لیا تھا. جس کا تجربہ انہوں نے بہت سے دوسرے موقعوں پر کیا. اسکا اثر سرکاری افسروں اور نیل والوں پر بہت ہوا. اب دوسری باتوںمیں ہم خیال ہونیکا راستہ کھل گیا. سر فرینکس سلائی کمیشن کے صدر تھے. وہ کچھ دنوں کے بعد «مدھیہ پردیش» (صوبہ متوسط) کے گورنر ہوگئے. لیکن اس وقت وہ کسی بڑے عہدے پر تھے. وہ بہت ھی تجربہ کار اور ہوشیار آدمی تھے. وہ

بھی چاھتے تھے۔ کہ ایک ایسی رپورٹ پیش کی جائے جس کے مطابق گورنمنٹ کارروائی کرسکے۔ اسلئے وہ بھی بہت خواہش مند تھے۔ کہ کسی نہ کسی طرح ایک ایسی رپورٹ تیار ہو جو بالکل متفقہ ہو اسطرح گاندھی جی کی بات سے نہ صرف وہ سب متأثر ہوئے۔ بلکہ ایک طرح سے ان کے مداح بن گئے۔ بات یہ تھی کہ رپورٹ کے اس حصہ کے متعلق سرکاری افسروں کو ھی خاص کر «سر فرینکس سلائی» کو بہت دشواری ھوتی۔ نیل والوں کا نمایندہ تو تمام باتوں کو آسانی سے غلط کہکر ان کی طرفداری کرسکتا تھا۔ گاندھی جی اور زمینداروں کے نمایندے کے سامنے جو ثبوت تھے۔ ان کی خاصکر سرکاری افسرونکی وقتاً فوقتاً پیش کردہ رپورٹوں کی بنیاد پر نیل والوں کے خلاف فیصلہ لکھنا آسان تھا۔ لیکن سرکاری افسر اس مشکل میں پڑجاتے کہ انکو یا تو نیل والوں کے خلاف رپورٹ لکھنی پڑتی اور یا گورنمنٹ کی شکایت کرنی۔ کیونکہ سب باتوں کو جانتے ہوئے بھی سرکار نے اتنے دنوں تک خاموشی اختیار کی اور اس کے افسروں نے بھی اکثر نیل والوں کی مدد کی اور اگر وہ ایسا نہ کرتے اور نیل والوں کو بری کرنا چاھتے تو سرکاری افسرو

کی رپورٹوں کو ھی غلط ماننا پڑتا اسلئے دبدھا سے بچنے کا جو راستہ گاندھی جی نے بتایا۔ اسکو انہوں نے بخوشی احسانمندی کے ساتھ مان لیا۔

کیونکہ سہ گانہ رواج کی وجہ سے ھی ساری زیادتیاں ھوتی تھیں اسلئے گاندھی جی نے زور دیا کہ اس کو قانون کے ذریعہ سے بند کردینا چاھئے۔ اسمیں سرکاری افسر ہم خیال ھوگئے۔ نیل والوں نے دیکھا کہ اسمیں رکاوٹ ڈالنی فضول ھے کیونکہ اب اسکو جاری رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ھوگا۔ وجہ اسکی یہ تھی کہ نیل کی جو کھیتی ایک بار بند ھوچکی تھی۔ اور اب جرمن جنگ کی وجہ سے پھر منافع دے رھی ھے۔ کبھی وہ پھر جرمن لڑائی بند ھوتے ھی بیکار ثابت ھوگی۔ اسلئے اسکو چھوڑنا ھی پڑیگا۔ اب اچھا یہی ھے کہ بات مان لی جائے اب لگان میں اضافہ چھوڑنے کا سوال آیا۔ کاشتکاری قانون کے مطابق چند حالتوں میں زمیندار کو لگان بڑھانے کا اختیار ھے۔ لیکن عدالتی حکم کے بغیر فی روپیہ دو آنہ سے زیادہ نہیں بڑھایا جاسکتا۔ یہاں نیل والوں نے اس سے کہیں زیادہ اضافہ کردیا تھا۔ انکی طرف سے یہ کہا گیا۔ کہ جتنی دستاویزیں لکھی گئی ھیں، اور ان کی

رجسٹری ہوچکی ہے، اور انکی پابندی کسانوں پر لازم ہے، اس لئے اگر ناجائز ٹھہرا کر «شرح بیشی» اٹھا دینی ہے تو کسانوں کو عدالت جا کر کارروائی کرنی چاہئے، کمیشن ان کی جائز دستاویزونکو رد نہیں کرسکتا، یہ بات قانونی طور سے ٹھیک تھی لیکن اگر اضافہ نہ چھوٹتا تو کسانوں پر لدا ہوا بوجھ ہمیشہ کیلئے قائم رہ جائیگا، مہاتما جی کا خیال تھا کہ اگر عدالت ہی میں جانا تھا، تو پھر کمیشن کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ کسانوں کے لئے لاکھوں مقدمے عدالت میں دائر کرنے اور ان کی پیروی کرنی غیر ممکن ہے. اسکا ایک تجربہ بھی ہوچکا تھا. گاندھی جی کے وہاں جانے سے پہلے ہی گیارہ مقدمے کسانوں کی طرف سے دائر ہوگئے تھے. نیل والوں نے ان مقدموں کو ایک طریقہ سے اپنے خلاف مورچہ مان کر پیروی کی. سب سے بڑے بیرسٹر کو پٹنہ سے لیگئے. آخر میں پہلی عدالت میں پانچ یا چھ مقدموں میں کسانوں کی جیت ہوئی اور باقی میں نیل والوں کی، ضلع کی «عدالت اپیل» نے کچھ فیصلے قائم رکھے اور کچھ کو رد کردیا. لیکن نتیجہ یہی ہوا. کہ وہاں بھی آدھے میں کسان جیتے اور آدھے میں نیل والے عدالت ضلع کے فیصلے

کے خلاف نیل والوں اور کسانوں نے ھائی کورٹ میں جو مقدمے دائر کئے تھے۔ ان کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ جب چند مقدموں کی یہ حالت تھی۔ تو لاکھوں مقدموں کا کیا حال ہوگا؟ اور یہ جھگڑا کتنے دنوں تک رہیگا۔ اسلئے دشمنی دور کرنے اور انصاف کے خیال سے بھی کمیشن ھی کو اس کے متعلق فیصلہ کرنا چاہئے۔ اور گورنمنٹ کو «شرح بیشی» منسوخ کردینی چاہئے۔ اس بات پر ایک رائے ہونا مشکل ہوگیا۔ لیکن گاندھی جی اسکو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اسلئے انہوں نے صلاح کا دوسرا راستہ نکالنا چاہا۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں۔ کہ قانون لگان کے مطابق تقریباً سبھی زمینداروں نے کچھ نہ کچھ اضافہ کیا تھا۔ اگر نیل والوں نے بھی اتنا ھی اضافہ کیا تھا۔ تو ان کے خلاف کوئی شکایت نہوتی۔ لیکن انہوں نے بہت زیادہ اضافہ کیا تھا اس لئے ھملوگوں نے سوچا کہ سارا اضافہ موقوف نہ کیا جائے بلکہ جو قانوناً جائز ھے۔ اسکو رہنے دیا جائے۔ اور زبردستی زیادہ بڑھایا ہوا اضافہ منسوخ کردیا جائے اس صورت میں کسانوں کو شکایت نہ ہونی چاہئے۔ مصالحت کا یہ راستہ ہوسکتا تھا۔ گاندھی جی

نے یہ تجویز پیش کی لیکن نیل والے اسپر بھی راضی نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح جہاں ہم پورا تاوان واپس کرنا چاہتے تھے وہاں وہ ایک پیسہ بھی واپس کرنا نہیں چاہتے تھے۔ صلح کے خیال سے آخر میں گاندھی جی کو مجبوراً اس پر راضی ہونا پڑا کہ اضافہ کا تقریباً تین چوتھائی سے زیادہ رہنے دیا جائے۔ اور ایک چوتھائی سے کم منسوخ کردیا جائے۔ اور تاوان کا صرف ایک چوتھائی حصہ واپس کیا جائے اور تین چوتھائی چھوڑ دیا جائے بہت بحث کے بعد کسی نہ کسی طرح اس پر سب راضی ہوگئے۔ اور دوسری باتوں کے متعلق بھی کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہوا۔ رپورٹ باتفاق رائے تیار کرکے گورنمنٹ کے پاس بھیجدی گئی۔ گورنمنٹ نے رپورٹ کی بنیاد پر ایک قانون بنایا۔ جسکے اعتبار سے «سہ گانہ رواج» کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اور اضافہ بھی مندرجہ بالا مقدار میں کم کردیا گیا، تاوان کے متعلق گورنمنٹ نے حکم دیا کہ جتنا روپیہ واپس ہوسکتا ہے، اتنا «بتیا راج» کے کسانوں کو واپس کرنے اور اسکے بتیا راج ہی نیل والوں سے وصول کرتا رہے۔ جلدی روپیہ واپس دلانے کے خیال سے یہ کیا گیا، ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا، کہ کسانوں کو

کوٹھی والے بہت سی مشکلونمیں ڈالیں گے، اسلئے کہ جو رقم وہ برابر لیا کرتے تھے وہ کبھی دیا نہیں کرتے تھے۔ اور اب تو وہ کسی حالت میں بھی واپس نہیں کریں گے۔ چونکہ «بتیا راج» «کورٹ آف وارڈس» میں تھا۔ اس سے گورنمنٹ بھی باسانی کورٹ کی معرفت وہ رقمیں واپس کرا سکتی تھی۔ اسکے علاوہ دوسرے مسئلوں کے متعلق بھی گورنمنٹ نے مناسب احکام جاری کردئے۔ اس طرح کمیشن کی رپورٹ پوری مان لی گئی۔ تھوڑے دنوں میں اسپر عمل ہونے لگا۔

اس طرح نیل کا جھگڑا ختم تو ہوا۔ لیکن جن شرطوں کو گاندھی جی نے مانا۔ ان پر کچھ لوگوں نے نکتہ چینی بھی کی ان کا کہنا تھا۔ کہ اضافہ اگر غلط تھا۔ تو وہ سارے کا سارا منسوخ ہو جانا چاہئے تھا۔ اسی طرح اگر تاوان ناجائز تھا۔ تو وہ بھی پورا واپس ہو جانا چاہئے تھا۔ ہملوگوں نے بہت سوچ بچار کر صلح کے شرائط کو مانا تھا ہمارے ماننے کا خاص سبب یہ بھی تھا۔ کہ ہم جانتے تھے۔ کہ اسطرح قانون کے ذریعہ یا گورنمنٹ کی مدد سے اگر کچھ نہ کیا گیا۔ تو عدالتوں میں جا کر کسان کچھ نہیں پاسکیں گے۔ گاندھی جی نے ہملوگوں سے صاف

صاف کہدیا کہ صلح چاہے کسی شرط پر ہوتی۔ "سہ گانہ رواج" اٹھ جانے کے بعد نیل والے اب یہاں نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ ان کا کاروبار زور و ظلم اور زبردستی سے ہی چلتا تھا۔ اگر یہ زیادتی اور زبردستی بند ہو جائے۔ تو وہ لوگ یہاں نہیں ٹھہر سکتے اسکا سبب یہ ہے کہ سہ گانہ رواج اٹھا دینے کا اور کسانوں کے دلوں میں جو بے خوفی اور جرأت پیدا ہو گئی ہے اسکا یہ اثر ہوگا کہ ان کی زیادتیاں اب کوئی کسان برداشت نہیں کریگا۔ اس لئے اسمیں اب کسی طرح کی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مہاتما گاندھی کے چمپارن آنے اور اس جانچ کے بعد رپورٹ پیش ہونے اور قانون بننے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد نیل والے اپنی زمینیں، کوٹھیاں اور مویشی وغیرہ بیچ کر چلے گئے۔ گاندھی جی کے وہاں پہنچتے ہی ان کا رعب اٹھ گیا تھا۔ اب صرف معمولی زمیندار کی حیثیت سے وہ وہاں رہ سکتے تھے، لیکن اسطرح انکا کام نہیں چل سکتا تھا۔ انہوں نے انہیں کسانوں اور "بتیا راج" کے ہاتھ اپنا سب کچھ بیچ دیا تھا، ان کو دام بھی اچھے مل گئے کیونکہ پہلی جرمن لڑائی کے بعد ابھی سبھی

چیزوں کے دام بڑھے ہوئے تھے، دام اچھے ملجانے سے نیل والونکو بھی کوئی رنج نہیں ہوا اور کسان تو بہرحال خوش ہوئے.

نیل والوں کے ساتھ گاندھی جی کے تعلقات بہت اچھے رہے یہ کام ختم ہوجانے کے بعد. اب انہوں نے تعلیم اور صفائی وغیرہ کا کام وہاں کے گاؤں میں کرنا چاہا. تو اس سے وہ خوش ہوئے. اگرچہ ان میں سے دو ایک نے کچھ رکاوٹیں بھی ڈالیں مگر دوسروں نے تھوڑی بہت مدد بھی کی. مہاتما جی کا خیال تھا. کہ جتنا کیا گیا اتنا کافی نہیں ھے. اسکو مستقل بنانے کے لئے ان میں سچی بیداری آنی چاھئے. نہیں تو نیل والوں کے چلے جانیکے بعد بھی وہ کسی نہ کسی ظلم کے شکار بنے رھینگے اسلئے انہوں نے تین چار پاٹھ شالاؤں (اسکولوں) کو جاری کیا. جنکو چلانے کیلئے اچھے اور پڑھے لکھے ایثار مجسم کام کرنے والے رکھے گئے مجھکو یہ افسوس رہا کہ میں وہاں کے کسی «پاٹھ شالے» میں خود نہ رہ سکا، اور پٹنہ جا کر پھر اپنے کام میں لگ گیا، کام کرنیوالے زیادہ تر مہاراشٹر گجرات ھی کے رھے، انمیں عورت مرد دونوں تھے. بہاریوں میں صرف بابو دھرنی دھر ایک اسکول چلاتے رھے، باھر کے لوگومیں

شری مہادیو بھائی ڈیسائی اور انکی بیوی شریمتی درگا بائی سابرمتی آشرم کے شری نرھری پارکھ اوو انکی بیوی «منی» بہن، خود «کستوربا» بمبئی کے شری وامن گھوکھلے اور انکی بیوی «اونتکا بائی» انجمن خادم ہند (سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی) کے ڈاکٹر شری کرشندیو وغیرہ ان اسکولونکو چلاتے رھے ، وہ لوگ بچونکو حرف پہچنواتے، اور گاؤنکی صفائی کرتے، عورتوں کو صفائی وغیرہ سکھاتے، گاؤں اور خاصکر کنوؤں کے آس پاس کی زمین کو صاف رکھنے کا سبق دیا کرتے، اسکے بعد گاؤں کے متعلق جو پروگرام گاندھی جی نے سارے ملک کیلئے جاری کیا، اسکا آغاز وھیں پر ھوا، یہ قومی کارکن کچھ دنوں کے بعد چلے گئے انکی جگہ پر دوسرے لوگ آکر کام کرنے لگے، انمیں کانگریس کے موجودہ جنرل سکریٹری شنکرراؤ دیو اور بیل گاؤنکے مشہور کانگریسی کارکن شری پنڈرک تھے، ان سب کے ساتھ جو پہنچان چمپارن میں ھوئی، وہ آخر تک رھی تقریباً سب نے اپنی زندگی ملک کے کاموں ھی میں صرف کردی :—

گاندھی جی وھاں ھملوگوں سے کہا کرتے تھے، کہ تملوگ سوراج کا بہت بڑا کام کررھے ھو، وہ یہ بھی کہا کرتے تھے

کہ یہاں بھی اگر سچائی کیساتھ کام ہوا، تو تم لوگ اپنے لئے
ایک بڑی پونجی حاصل کرلوگے، جو آگے چلکر پبلک خدمات
کیلئے بہت قیمتی ثابت ہوگی، ہم نے ان باتونکو حرف بہ حرف
تعمیل کی، اس میں شک نہیں کہ سوراج کا وہ بہت بڑا کام تھا،
بہار کیلئے تو وہ ایک طرحسے پبلک کاموں کا آغاز تھا، اس سے
پہلے صرف صوبائی کانفرنس کر کے قرار داد منظور کرلینی.
کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوجانا، کچھ روپیہ کسی
کے پاس ہو تو کانگریس کو دیدینا. اخباروں میں کچھ لکھدینا
کونسل کے ممبر ہوں تو سوال کردینے، اور تقریر کردینی، پبلک
کامونکا یہی آغاز اور یہی انجام تھا، عوام کے ساتھ کسی قسم
کا ربط و تعلق نہیں تھا. پبلک جلسے بھی «ہوم رول» تحریک
سے پہلے بہت کم ہوا کرتے، اور جو ہوتے بھی تو وہ صرف
شہروں ہی میں ہوا کرتے تھے. ان میں تقریریں زیادہ تر انگریزی
میں ہوتی تھیں، ان جلسونمیں شریک ہونیوالے بھی وہی ہوتے
جو انگریزی جانتے تھے، اور وہ سرکاری ملازم نہیں ہوتے
تھے. گاندھی جی کے چمپارن جانے نے نئی زندگی پیدا کردی
ضلع چمپان کے لوگوں میں بہت زیادہ بیداری ہوگئی تھی، وہاں

کے کونے کونے کے لوگ گاندھی جی کے نام وز کام سے واقف ہوگئے، یہ اثر چمپارن تک ھی محدود نہیں رھا، اگرچہ گاندھی جی نے کوئی جلسہ وغیرہ کرکے پرچار کا کام نہیں کیا تھا، لیکن پھر بھی صوبہ بھر میں ایک نئی لہر سی دوڑ گئی۔ ہوم رول کا جو کام ھوا تھا اسکی وجہ سے اسمیں بہت زیادہ زور پہونچگیا گاندھی جی نے جو نیا راستہ دکھلایا اسکو بہار کے لوگوں نے اسیوقت مان لیا جب بعد میں گاندھی جی نے ملکی تحریک شروع کی تو بہار بغیر چوں چرا کے انکے ساتھ ھوگیا، جہانتک جنتا کا تعلق ھے پورے بہار میں ابتک وھی بات ھے۔ سوراج تحریک میں بہار کا حصہ ملک کے کسی دوسرے علاقہ کے حصے سے کم نہیں ھے گاندھی جی کو بھی بہار پر بھروسہ تھا کچھ دوسرے صوبوں کے لوگ بہار کو گاندھی کا بے مثل خادم کہا کرتے تھے یہ بات ٹھیک ضرور ھے کیونکہ بہار کے لوگون کا بھروسہ تجربہ کا نتیجہ تھا۔ ان لوگوں نے انکے پروگرام سے فائدہ اٹھایا تھا۔ جو بات «ان ھونی» سمجھی جاتی تھی۔ اسکو ان لوگوں نے اپنی آنکھونکے سامنے ھوتے دیکھا تھا مجھے یقین ھے کہ اگر سارا ملک ویساھی آنکھ بند کرکے مقلد ھوجاتا تو آج ملک بہت اونچا ھوگیا ھوتا۔

ساتواں باب

چمپارن آنے سے پہلے ھی گاندھی جی نے سابر متی آشرم میں ستیا گرہ آشرم کو قائم کر لیا تھا. وہ چمپارن یہ سوچ کر آئے تھے کہ پانچ سات روز کے اندر وہاں کا کام کر کے آشرم واپس چلے جائینگے. لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں پانچ سات روز کے بجائے مہینوں رہنا پڑیگا، تو انہوں نے آشرم کے رہنے والوں کو اطلاع کر دی کہ وہاں کا کام وہیں کے لوگ چلائیں، کیونکہ کچھ عرصہ تک ان (گاندھی جی) کے واپس آنے کا امکان نہیں ہے. اس طرح آشرم کا کام وہاں چلنے لگا. چمپارن سے وہ جو کچھ ھدایتیں دے سکتے تھے، دیتے رہے.

چمپارن میں رہتے ہوئے انہوں نے جنوبی ھند میں «ھندی پرچار» کا کام شروع کیا. اس کی صورت یہ ہوئی

که ایک بار ان سے ملنے کے لئے سوامی ست دیو جی آئے سوامی جی کی شہرت بہت تھی ۔ بہار اور خاصکر چمپارن میں وہ کبھی کبھی آیا کرتے اور اپنی تقریروں سے لوگونکو بیدار کرتے تھے ۔ ان کی هندی کتابیں بھی رائج تھیں ۔ ان کے غیر ملکی یا بدیشی تجربوں سے لوگ واقف اور متاثر تھے ، وہ گاندھی جی سے ملنے بتیا آئے ۔ گاندھی جی نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے سابر متی آشرم میں جا کر رهیں ، انہوں نے ویسا هی کیا ، پھر کچھ دنوں کے بعد گاندھی جی نے ان کو مشورہ یہ دیا کہ جنوبی هند میں جا کر هندی کا پرچار کریں ، سوامی جی مدراس گئے ۔ اور وهاں کچھ عرصہ تک کام کرتے رهے ۔ گاندھی جی نے ان کے ساتھ اپنے بیٹے شری دیو داس گاندھی کو بھی هندی پرچار کے لئے بھیجا ، « هندی ساهتیا سمیلن » (انجمن ادبیات هندی) سے میرا تعلق پہلے هی اجلاس سے هوگیا تھا ، جو بنارس میں « پنڈت مدن موهن مالویہ » کی صدارت میں سنۂ ۱۹۱۰ میں هوا تھا ، کیونکہ میں اس پہلے جلسے میں شریک هوا تھا ، جهاں تک مجھے یاد هے ، میں نے پہلے

پہل «شری پرشوتم داس ٹنڈن» کو وہیں دیکھا تھا، شاید ان سے واقفیت بھی ہوگئی تھی، لیکن پوری اور مخصوص واقفیت تو اس وقت ہوئی جبکہ اس کا دوسرا جلسہ کلکتہ میں ہوا، اس کی مجلس استقبالیہ کا میں صدر تھا، انجمن اس وقت تک اپنی ابتدائی حالت پر تھی مجھے یہ یاد نہیں کہ اس نے ہندی پرچار کا کام کہاں شروع کیا؟ لیکن جنوبی ہند میں گاندھی جی کے ہندی پرچار کے کام نے ہندی پرچار کے لئے میری آنکھیں کھول دیں اور ایک بہت بڑا میدان پیدا کردیا، اور میں یہ خواب دیکھنے لگا کہ وہ ایک دن سارے ملک کی سرکاری زبان ہوجائیگی۔ اگرچہ اس تبلیغی کام کے ساتھ میرا کسی قسم سے براہ راست تعلق نہیں تھا لیکن پھر بھی میں اس میں دلچسپی لینے لگا کچھ بہار کے پرچار کرنے والے بھی وہاں گئے، انمیں سے کچھ تو آج تک وہاں کام کر رہے ہیں، شروع میں جو پرچار کرنے والے جاتے تھے وہ مجھ سے پوچھکر جاتے، اسطرح وہاں جو کام ہوتا اس کی معلومات مجھے رہتیں. گاندھی جی سے اسکا تعلق ہونے سے یہ کام اور بھی مضبوط ہوتا گیا.

مہاتما جی کے ہندی پرچار کے کام سے متاثر ہوکر ، انجمن ادبیات ہندی » ان کو اندور کے اجلاس کا جو سنہ ۱۹۱۸ میں تھا ، صدر منتخب کر لیا ، مہاتما جی وہاں چمپارن ہی سے گئے ، ہم میں سے کئی آدمی ان کے ساتھ ہی گئے ، وہاں کا جلسہ بہت شان دار ہوا ، جنوبی ہند میں ہندی تبلیغ کے لئے وہاں پر چندہ کیا گیا ، انجمن نے ان کی اس ترغیب و خواہش پر اس کام کو اپنا اہم کام سمجھکر اس کو ہاتھ میں لے لیا ․

اندور کے متعلق ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر باعث لطف ہوگا ، اگرچہ جس میں ایک لطیف حقیقت بھی ہے ․ مہاتما جی اور ان کے ساتھ کے ہملوگ ریاست کے مہمان تھے ، اس لئے وہاں خاطر و مدارات کا بڑا انتظام تھا ، جتنے برتن ہمارے کام کے لئے وہاں رکھے گئے تھے ․ یہاں تک کہ نہانے کے لئے پانی رکھنے کا برتن بھی سب چاندی کے تھے ، راج کے کارندے دن رات خاطر داری میں لگے رہتے تھے ، مہاتما جی تو اپنا سادہ مونگ پھلی وغیرہ کھانا الگ کھا لیا کرتے تھے ․ لیکن ہملوگوں کے لئے

بہت سے پکوان وغیرہ چاندی کے بڑے تھالوں میں اور چاندی کی کٹوریوں میں چنے گئے، ھملوگوں نے نہایت اچھی طرح سے کھانا کھایا، مہاتما جی سے کھانے کے بعد جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے ہم سے پوچھا کہ تم لوگوں نے کیا کھایا؟ جو کچھ ہم نے کھایا تھا وہ مہادیو بھائی نے سب بیان کردیا، تھوڑی دیر کے بعد جب ریاست کے کارندے آئے تو مہاتما جی نے ان سے کہا کہ آپ ان لوگوں کو جیسا کھانا دے رہے ھیں ویسے کھانے کی ان کو عادت نہیں ھے اسلئے یہ لوگ یہاں بیمار پڑجائینگے، آپ ان کے لئے معمولی سادہ پھلکا اور سبزی کا انتظام کردیجئے، تھوڑا دودھ بھی دے دیا کیجئے، ان کے لئے یہی صحت بخش اور اچھا کھانا ہوگا، بس اس کے بعد سے چاندی کے برتنوں میں ھملوگوں کو وھی سادہ کھانا ملنے لگا، جو ھمکو چمپارن میں گاندھی جی کے ساتھ ملا کرتا تھا۔

گاندھی جی مانتے تھے کہ "حس ذائقہ" پر فتح پانا بہت مشکل ھے۔ ھملوگ جو کھانا کھاتے ھیں وہ جسم کی حفاظت اور اس کو مضبوط بنانے کے لئے نہیں بلکہ صرف مزے

کے لئے ہوتا ہے، کھانے کا اثر تندرستی پر بھی پڑتا ہے، اسلئے ہم میں سے جن کے پاس دولت ہوتی ہے. وہ زیادہ اور غیر صحت بخش لیکن مزیدار کھانا کھا کر بیمار پڑتے ہیں لیکن جن کے پاس دولت نہیں ہوتی وہ صحت بخش اور کافی غذا نہ ملنے کی وجہ سے بیمار اور کمزور ہوجاتے ہیں اسلئے انہوں نے خود چمپارن ہی میں سادہ کھانے اور ذائقہ پر فتح پانے کی مثال ہمارے سامنے رکھ دی تھی، وہ کچھ دنوں کے بعد رسوئی کھانے لگے لیکن اسمیں ان کا ایک دستور تھا یعنی چاہے پھل ہوں یا کھانا کسی میں پانچ چیزوں سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں، ان پانچ چیز میں نمک مرچ جیسی چیزیں ایک ایک علاحدہ علاحدہ سمجھی جاتی تھیں اسطرح اگر ہملوگوں کے لئے کوئی چیز «مسالہ دار» تیار ہوتی تھی تو ان کے نزدیک وہ غذا نہیں ہوتی تھی، کیونکہ مسالے میں ہی پانچ چھ چیزیں ہوجاتی تھیں. لیکن اس اصول کے علاوہ بھی وہ «مسالے دار» چیزوں کا استعمال برا سمجھتے تھے، اسکا کارن یا سبب یہ تھا کہ ایک تو یہ چیزیں زیادہ تر گرم اور خواہشوں کو ابھارنے والی ہوتی ہیں، دوسرے یہ مزے کو

بھی بدل دیتی ھیں جس کی وجہ سے آدمی زیادہ کھا لیتا ھے اور پھر ایسی چیزیں کھا لیتا ھے جو نقصان دیتی ھیں۔ چمپارن میں جب انھوں نے اناج کھانا شروع کیا اس وقت بھی نہ تو وہ نمک کھاتے تھے اور نہ دودھ یا دال صرف چاول اور ابلی ہوئی سبزی ھی کھایا کرتے تھے۔ ابلی ھوئی چیزوں میں بھی خاص کر کریلا کھایا کرتے تھے جو بہت زیادہ ابال دیا جاتا تھا، وہ اسی کے پانی کے ساتھ «بھات» (چاول) ملا کر بہت مزے لے لے کر کھا لیا کرتے تھے کریلا بہت کڑوا ھوتا ھے۔ اسکا ابالا ھوا پانی تو اور بھی کڑوا ھوتا ھے لیکن ھم دیکھتے تھے کہ اسی کو وہ خوش ھو ھو کر اور مزے لے لیکر کھاتے تھے، اندور میں جو انھوں نے ھملوگوں کے لئے پکوان کی ممانعت کردی تھی وہ بھی اسی تجربہ کا ایک جز تھا، ھم نے یہ بھی دیکھ اور سمجھ لیا کہ سادہ کھانا صحت بخش ھونے کے علاوہ کم خرچ بھی ھے۔ بعد میں جب بہت سے مقامات پر آشرم کے نام سے سوسائٹیاں قائم ھوئیں تو ان میں سادہ کھانا اچھی طرح رائج ھوگیا۔ اگرچہ یہ کہنا مبالغہ ھوگا کہ مسالے کا خرچ

ایکبارگی بند ہوگیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ کم ضرور ہوگیا، وہ جہاں جاتے اور جو کام ہاتھ میں لیتے اسمیں سے صرف ایک ہی معاملے کو اہم قرار دے کر اس کو کرتے لیکن ساتھ ہی جہاں تک ممکن ہوتا اپنے دوسرے خیالات بھی پھیلاتے رہتے تھے. یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے سبھی قسم کے مسئلوں پر صرف روشنی نہیں ڈال گئے، بلکہ عملی شکل سے ان کے حل کرنیکی تدبیر بھی بتا گئے.

گاندھی جی کے صدر ہوتے ہی تبلیغی کام کو سمیلن (انجمن) میں جگہ ملتے ہی ہندی کا کام نہایت زور سے دکھن میں چلنے لگا، دکھن کو انہوں نے اسلئے ہاتھ میں لیا کہ وہاں کی زبان بالکل الگ ہے، اگر وہاں ہندی پرچار ہو جائے تو دوسرے حصوں میں اسکا پرچار مشکل نہ ہوگا. وہ تقریباً کٹھن کام ہی ہاتھ میں لیا کرتے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے اگر مشکل کام میں کامیابی ہوگئی تو پھر آسان کام میں کامیابی ہو ہی جائیگی، چمپارن کا کام بھی بہت مشکل تھا. بہار میں اس زمانہ میں جو لوگ پبلک کام میں حصہ لیا کرتے تھے ان سب لوگوں نے ان کو منع کیا تھا لیکن

انہوں نے کسی کی نہ سنی، آخر انہوں نے کامیاب ہو کر ایک نیا راستہ کھول ہی دیا.

گاندھی جی ابھی چمپارن ہی میں تھے کہ ضلع کھیڑا (گجرات) کے کسانوں نے فصل کم یا ضائع ہونیکی وجہ سے گورنمنٹ کی مالگذاری کم کرنے کے لئے تحریک شروع کی تھی گاندھی جی وہاں کی حالت جانتے تھے، وہاں کے کسانوں نے ستیا گرہ کا ارادہ کیا، سردار ولبھ (پٹیل) نے گاندھی جی کے ساتھ ملکر ان لوگوں کی رہنمائی کی، اندور سے میں مہاتما جی کے ساتھ سابر متی گیا، وہاں ابھی مکانات تیار نہیں ہوئے تھے، شاید ایک مکان کا تھوڑا سا حصہ بنا تھا، سب لوگ بانس کی چٹائیوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں ہی رہتے تھے، آشرم کی زندگی شروع ہو چکی تھی، صبح و شام پرارتھنا (دعا)، کھانا، اور جہانتک مجھے یاد ہے کچھ چرخے کے کام کی ابتدا ہوچکی تھی، مہاتما جی وہاں ایک ہی روز ٹھر کر کھیڑا کے دورے پر چلدئے، میں بھی ان کے ساتھ گیا، یہ شاید اپریل کا آخری ہفتہ تھا، وہاں دھوپ بہت سخت تھی، آشرم سے ریل پر سوار ہو کر ہملوگ کچھ دور

گئے، وہاں سے کئی گاؤں میں گئے اور کچھ لوگوں سے ملے مہاتما جی ان لوگوں سے گجراتی میں باتیں کیا کرتے تھے، اسلئے میں کچھ سمجھ نہیں سکتا تھا، لیکن اتنا اندازہ ضرور کر لیتا تھا کہ لوگوں کو یہ بتایا جاتا تھا کہ اگر مالگذاری ادا نہ کرنیکی وجہ سے مویشی وغیرہ ضبط کئے جائیں تو اس کو بھی برداشت کرنا چاہئے لیکن مالگذاری ہرگز ادا نہ کرنی چاہئے۔

ایک دن دوپہر کی سخت دھوپ میں گاندھی جی کے ساتھ میں جا رہا تھا، زمین ریتیلی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت تپ رہی تھی، میں تو جوتا پہنے ہوئے تھا لیکن مہاتما جی اس زمانہ میں چپل بھی نہیں پہنتے تھے، بالو پر چلنے لگے، ابھی کچھ دور اور چلنا تھا، جب کہیں کسی درخت کا سایہ مل سکتا تھا لیکن وہاں تک پہونچنے کے لئے راستہ میں سوائے گرم بالو کے اور کچھ نہ تھا، مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں تھی لیکن میں نے یہ دیکھا کہ ان کو بہت تکلیف تھی، میرے کندھے پر ایک چادر تھی میں نے اس کو ان کے پیروں کے سامنے ڈال دیا تا کہ اس پر ان کے پیروں کو

تھوڑا سا آرام مل جائے، لیکن انہوں نے اس پر پیر نہیں رکھا اور مجھ سے کہنے لگے کہ اسکی کیا ضرورت ھے؟ اس دیش میں کروڑوں آدمی اسی دوپہر میں اس سے بھی زیادہ گرم بالو میں بغیر جوتے کے چلتے ھیں اور کام بھی کرتے ھیں» میں نے مجبور ھوکر اپنی چادر اٹھالی اور ان کے پیچھے چپ چاپ چلتا رھا۔ اسی وقت مجھے چمپارن کا بھی ایک واقعہ یاد آ گیا۔

مہاتما جی وقت کی بہت پابندی کرتے تھے، وہ اپنا ایک منٹ بھی برباد نہیں ھونے دیتے اور نہ وہ دوسرے کا کرنے ان کو جو وقت کسی کی ملاقات کے لئے دیا جاتا، ٹھیک اسی وقت اگر ان کو جانا ھوتا وہ پہنچ جاتے، اگر دوسرے کو ان سے ملنے آنا ھوتا تو اس کو بھی عین وقت پر ان کے پاس پہنچ جانا پڑتا، ھمکو اکثر تجربہ ھوا ھے کہ جب کبھی مقررہ وقت سے ایک دو منٹ بعد بھی اگر کوئی پھونچا تو وہ اسکو کسی نہ کسی طرح یاد دلا دیتے کہ «دیر کر کے آئے ھو» اسی طرح اگر کسی نے وقت مانگا اور کہہ دیا کہ صرف پانچ ھی منٹ چاھئیں اور انہوں نے بھی اس پانچ منٹ کے

وقت کو منظور کرلیا تو ان پانچ منٹوں میں کام پورا نہ ہونے پر وہ کام کو ادھورا ہی چھوڑ دیتے تھے، اور کہہ دیتے تھے کہ آپ کا وقت پورا ہوگیا، اگر آپ کو اور وقت چاہئے تو پھر لیجئے۔

چمپارن میں ہملوگ ان باتوں کو اچھی طرح جانتے نہیں تھے، اس لئے کبھی کبھی کچھ غفلت ہوجاتی تھی۔ ایک دن مجسٹریٹ سے ان کو دو بجے ملنا تھا مجسٹریٹ کا گھر کچھ دور تھا، اس لئے کرایہ کا گھوڑا گاڑی منگا دینے کا انتظام کیا گیا، انہوں نے پوچھا تھا کہ پیدل جانے میں کتنا وقت لگے گا؟ ان سے کہا گیا کہ آدھ گھنٹہ، اس پر انہوں نے کہا کہ ڈیڑھ بجے، پانچ منٹ پہلے ہی یہاں گاڑی تیار رہنی چاہئے، ہملوگوں نے سوچا تھا کہ جب پیدل جانے میں آدھ گھنٹہ لگے گا تو گھوڑا گاڑی کے لئے آٹھ دس منٹ کافی ہونے چاہئیں اس لئے اگرچہ گاڑی والے کو ڈیڑھ بجے سے پہلے آنے کو کہا گیا لیکن پھر بھی ایسا کوئی انتظام نہ ہوسکا کہ کوئی جاکر اسکو ٹھیک وقت پر لے آتا گاندھی جی یہ معلوم کر کے کہ گاڑی ابھی نہیں آئی، وہاں سے

چلدئے، ھملوگوں نے بہت کہا کہ گاڑی ابھی آتی ھے، جو دو بجے سے پہلے وھاں پہنچ جائیگی، اگر تھوڑی دیر کے بعد بھی آپ جائینگے تو وقت پر پہنچ جائینگے، لیکن انہوں نے نہ مانا. اس سخت دھوپ میں وہ چلدئے، دریافت کرنے پر بعد میں ھملوگوں کو معلوم ھوا کہ انہوں نے ایسا اس لئے کیا کہ وہ ٹھیک وقت پر پیدل ھی پہنچ جائیں، کیونکہ کسی وجہ سے اگر گاڑی نہ آتی تو وہ دیر سے چلتے اور وھاں ٹھیک وقت پر نہ پہنچ سکتے. ھملوگوں کو اسی سے معلوم ھوا کہ وقت کی وہ کس قدر پابندی کیا کرتے تھے، یہ صرف پبلک کام ھی کے لئے نہیں بلکہ روزانہ کی عبادت کے لئے بھی ایسے ھی پابند تھے. کھیڑا کی اسی جاترا میں میری پہلی ملاقات سردار ولبھ بھائی پٹیل، شری شنکر لال ھلکر اور شریمتی انسوما بائی وغیرہ سے ھوئی. وہ دن مجھے یاد ھے جس روز «کرم سر» گاؤں میں ھملوگ گئے تھے. وھیں سردار ولبھ بھائی پٹیل کا گھر دیکھا اور وھیں کھانا کھایا تھا. جو ملاقات اس وقت ھوئی وہ بعد میں ایک گہرے تعلق کی شکل مین قائم ھوگئی.

گجرات کے گانوؤں کا دو تین دن تک دورہ کر کے میں پٹنہ واپس آ گیا. میں نے وہاں پوچھا تھا کہ اگر میری ضرورت ہو تو میں ٹھر جاؤں، لیکن اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور مجھے چھٹی مل گئی.

کھیڑا کی ستیہ گرہ تھوڑے ہی دنوں میں پوری کامیابی سے ختم ہوئی، اس کے بعد گاندھی جی اس ضلع میں دورہ کر کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرانے کی کوشش میں لگ گئے اسوقت جرمن لڑائی بہت زور سے چل رہی تھی، لارڈ چمسفورڈ کو مہاتما جی نے زبان دی تھی کہ وہ مدد کرینگے اس وعدہ کو پورا کرنے کے لئے اس گرمی کے موسم میں گانوؤں کا دورہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کچھ دنوں کے بعد سخت بیمار پڑ گئے.

جب گاندھی جی نے فوج میں بھرتی کا کام شروع کیا تو اسکا اثر بہار پر یہ ہوا کہ صوبہ کی گورنمنٹ بھی بھرتی کے کام میں ہم سے مدد لینے لگی، گاندھی جی کے ساتھ چمپارن میں رہنے کیوجہ سے لوگوں سے کافی واقفیت ہو گئی تھی، شاید سرکاری ملازموں کے دل میں بھی یہ بات

بیٹھ گئی تھی کہ ہمارے ایسے آدمی اس کام میں مدد پہنچا
سکتے ہیں، اسلئے جب پٹنہ میں ایک صوبائی کمیٹی بنائی گئی
تو اسکا ممبر بننے کے لئے مجھ سے بھی کہا گیا، چونکہ
گاندھی جی اس کام کو کر رہے تھے اسلئے میں نے بھی
اسکو منظور کرلیا، مجھ سے خاص طور پر یہ امید کی جاتی
تھی کہ نوجوان طبقہ میں سے کچھ لوگوں کو میں لڑائی میں
جانے کے لئے تیار کر سکونگا کیونکہ «بہار انجمن طلباء»
(بہار اسٹوڈینس یونین) کی وجہ سے طبقۂ طلباء کے ساتھ
میرا بہت زیادہ ربط تھا، پٹنہ یونیورسٹی «بل» کے خلاف
جو تحریک اٹھی تھی اس سے میری ساکھ قائم ہوگئی، میں
نے کچھ کوشش تو کی لیکن نا کام رہا. کیونکہ طلبا کا
طبقہ لڑائی میں جانے کے لئے تیار نہیں تھا، گاندھی جی کو
بھی کامیابی نہیں ہوئی لیکن جہاں تک ان کے بس میں
تھا، انہوں نے اس سلسلے میں کچھ اٹھا نہیں رکھا اتنی زیادہ
محنت کی کہ ان کی جان بھی جوکھوں میں پڑگئی. تھی میں
اپنے بارے میں ایسا نہیں کرسکتا کچھ تھوڑی بہت کوشش ضرور
کی لیکن اور کاموں کیساتھ اسکو بھی ایک کام سمجھا صرف اسی میں

ساری قوت صرف نہیں کی. اگر صرف بھی کرتا تو شاید بہت زیادہ نتیجہ نہ نکلتا، ہم نے اس سے یہ بھی سمجھ لیا کہ گاندھی جی جو کام ہاتھ میں لے لیتے ہیں، اس کو پورا کرنے کے لئے اپنی ساری قوت لگا دیتے ہیں، ہم نے اپنے میں یہ کمی پائی. صرف اسی وقت نہیں بلکہ بعد میں بھی، ایسی پوری توجہ سے اور نتیجہ کی کوئی پروا کئے بغیر ہم نے اپنے میں کبھی کام کرنے کا میلان نہ پایا.

اسی زمانہ میں «مونٹیگ چمسفورڈ رپورٹ» شائع ہوئی. انہوں نے ہندوستان کے آئین میں اصلاح کرنے کیلئے یہ رپورٹ تیار کی تھی. دیس کی بیداری اور «ہوم رول» تحریک کی وجہ سے ہی حکومت برطانیہ نے آئین میں اصلاح کرنے کا اعلان کیا تھا. مانٹیگو وزیر ہند تھے اور چمسفورڈ وائسرائے، دونوں کے ہندوستان میں پھرنے اور لیڈروں سے ملنے کے بعد یہ رپورٹ لکھی تھی. رپورٹ کی سفارشوں کے متعلق ملک میں کافی اختلاف ہوگیا تھا. کچھ لوگ اسکو ناکافی سمجھتے تھے، اور کچھ لوگ ناکافی سمجھتے ہوئے بھی شکرگذار تھے. اسوقت

کانگریس کے ایک مخصوص اجلاس کا ارادہ کیا گیا، وہ اجلاس بمبئی میں ہونے والا تھا، اجلاس کے لئے صدر کے انتخاب کا مسئلہ آیا، اسی کے متعلق مسز «اینی بیسینٹ» پٹنہ آئیں، مجھ سے بھی اسکے متعلق ان سے باتیں ہوئیں، یوں تو میں نے ان کی تقریروں کو پہلے بھی سنا تھا، لیکن ان سے جان پہچان نہیں ہوئی تھی، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ «تم کس کا صدر ہونا پسند کرو گے؟» میں نے گاندھی جی کا نام لیا، انہوں نے کہا کہ «وہ دوسرا کام تو خوب کر لیتے ہیں لیکن وہ سیاست دان (پولیٹشن) نہیں ہیں» انہوں نے میری تجویز، جو محض خانگی طور سے بات چیت میں ہی کی گئی تھی، نامنظور کردی. شاید وہ پہلے ہی سے یہ ارادہ کر کے آئی تھیں کہ شری سید حسن امام صدر بنائے جائیں، حسن امام صاحب اسوقت ہائی کورٹ کے جج نہیں ہوئے تھے، اور کانگریس کے جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور اسمیں دلچسپی لیتے ہوئے چندہ بھی دیا کرتے تھے. کلکتہ ہائی کورٹ کی ججی کے زمانہ میں فوجداری مقدمات کے سلسلے میں انہوں نے اچھی شہرت

حاصل کی تھی، سنہ ۱۹۱٦ میں جب پٹنہ میں ھائی کورٹ قائم ہوا تو وہ استعفاء دے کر پٹنہ چلے آئے اور یہاں بیرسٹری کرنے لگے. انہی ساری باتوں سے ان کی شہرت بڑھی اور وہ ایک مشہور آدمی ہوگئے تھے. شریمتی مسز اینی بیسینٹ نے لوگوں سے رائے لیکر انہیں کو صدر بنایا، جس وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ گاندھی جی «سیاست دان» نہیں ھیں. میں نے اسی وقت دبی زبان سے اسکی مخالفت بھی کی تھی اور چمپارن میں جو بڑا کام گاندھی جی نے کر کے دکھایا تھا، اسکا میں نے حوالہ بھی دیا لیکن میری ایک نہ چلی، جب انہوں نے اپنی طرف سے حسن امام صاحب کا نام پیش کیا تو اسکی مخالفت میں میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا، میرا قیاس ھے کہ شریمتی مسز اینی بیسنٹ کا بھی خیال گاندھی جی کے متعلق قائم رہا کیونکہ گاندھی جی نے جب کل ھند ستیا گرہ شروع کی تو شریمتی اینی بیسنٹ نے اسکی سختی سے مخالفت کی یہاں تک کہ گاندھی جی کو ایک طرح سے شیطان سے تشبیہ دیتے ہوئے انہوں نے اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ «وہ تاریک اور اندھی طاقتوں کی نمائندگی کرتے ھیں.

گاندھی جی اتنے بیمار تھے کہ وہ بمبئی نہ جاسکے. میں گیا اور وھاں شریک ھوا، کانگریس ختم ھونے پر میں گاندھی جی سے ملنے کے لئے احمدآباد چلا گیا. اس زمانہ میں وہ وھیں مرزا پور میں سیٹھہ انبا لال کی کوٹھی میں ٹھرے ھوئے تھے، میں بھی وھیں جا کر ٹھرا، ان کو پیٹ کی بیماری تھی اور بخار ھو جایا کرتا تھا. وہ کچھہ دوا نہیں پیتے تھے. اسوقت دودھ یا دودھ سے تیار کی ھوئی کوئی چیز بھی استعمال نہیں کرتے تھے. لوگ پریشان تھے کہ وہ کیونکر صحت یاب ھونگے، میں نے دو چار روز ان کے پاس ٹھرنے کے لئے سوچ لیا تھا اور ان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا کرتا، باقی وقت ادھر ادھر پھرنے میں صرف کردیتا تھا، ایک روز شہر میں کچھہ پرانی تاریخی چیزوں کو دیکھنے چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو معلوم ھوا کہ وہ آشرم چلے گئے. میں بھی آشرم چلا گیا اور وھیں ٹھرا. میرا ارادہ تھا کہ میں دوسرے ھی روز واپس چلا جاؤنگا.

اسوقت تک آشرم میں کچھہ مکانات بن گئے تھے، وھاں کے ایک کمرے میں ایک چارپائی پہ وہ لیٹے تھے

میں بہت صبح وہاں ان سے ملنے کے لئے گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ فکر مند اور پریشان ہیں، تھوڑی دیر میں شری چھگن لال گاندھی آ گئے، تھوڑی دیر کے بعد مہاتما جی خود ہی باتیں کرنے اور کہنے لگے کہ "کل میں بخار کی حالت میں ضد کر کے یہاں چلا آیا، میں وہاں اس بڑے محل میں پڑے پڑے سوچتا تھا کہ اس محل میں میرا کیا کام ہے، مجھے تو آشرم میں ہی رہنا چاہئے۔ اور جب تک آشرم میں نہ جاؤں، مجھے سکون کہاں اور کیسے ملیگا، یہاں بھی آ کر میں بہت دیر تک جاگتا اور سوچتا رہا کہ میں کیا کر رہا ہوں، ایک کام بھی پورا نہیں کر پاتا کہ دوسرے میں ہاتھ لگا دیتا ہوں وہ ابھی ادھورا ہوتا ہے کہ اس کو چھوڑ کر تیسرے کو شروع کر دیتا ہوں، اس آشرم کو میں نے بہت سی امیدوں اور حوصلے سے قائم کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں رہ کر جیسا یہ آشرم ہونا چاہئے ویسا اسے بنانے اور جیسے آشرم کے رہنے والے ہونے چاہئیں، ویسے ہی ان کو تیار کرنے میں لگا رہوں۔

لیکن وہ کام ابھی ٹھیک طرح سے شروع بھی نہ ہوا۔ کہ مجھے چمپارن چلا جانا پڑا، اور تم لوگوں پر آشرم چلانے کا سارا بوجھ پڑگیا۔ یہانتک کہ جس روز سے آشرم کا کام باضابطہ شروع ہوا، اس روز بھی میں نہ آسکا، چمپارن میں جہانتک کہ گورنمنٹ سے کام لیکر کسانوں کو راحت دلانے کا تعلق تھا، وہ تو ایک طرحسے پورا ہوا، لیکن کیا اتنی ھی بات سے کسانوں کا بھلا ہوگا؟ ان میں رہ کر ان کی رھن سہن سدھارنا، ان کو بے خوف بنانا، اور سچی تعلیم دینی اصل کام ھے۔ اس کیلئے میں نے کچھ اسکول کھلوائے، وھاں انہیں رہ کر کچھ کام کرنا چاہئیے ایسا سوچا ضرور لیکن وہ تعمیری کام ابھی شروع نہ ہوا تھا، کہ مجھے «کھیڑا» جانا پڑا، کھیڑا کا کام ابھی ادھورا ھی تھا۔ کہ فوج کی بھرتی کا کام آ گیا۔ وھی کرتے کرتے اتنا بیمار ہوگیا ہوں معلوم نہیں کیا ہوگا۔ احمدآباد کے مل مزدوروں میں بھی میں نے کام شروع کیا لیکن اسکو بھی ادھورا چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ جانا پڑا۔ تو کیا ساری زندگی اسی طرح کے ادھورے کام کرکے ختم کرنا ھے۔ کل وہ محل مجھے آرام نہیں دیرھا تھا۔ بلکہ تکلیف دیرھا تھا۔ اسی لئے میں اتنی ضد کرکے بخار کی حالت میں

یہاں چلا آیا یہی رات بھر سوچتا رہا کہ اب آئندہ کیا ہوگا میں کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں.

اسطرح کی باتیں کرتے کرتے وہ اتنے جوش میں آگئے. کہ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے. وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، ہملوگ چپ بیٹھے دیکھتے رہے. کیا بولتے؟ کیا کہتے؟ اور ان کو کیا سمجھاتے؟ تھوڑی دیر کے بعد جب سکون ہوا تو خود ہی بولے «اتنے آنسو بہنے سے کچھ سکون ہوا جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا» اتنا کہکر چپ ہوگئے، پھر تھوڑی دیر کے بعد آشرم کی اور دوسری باتیں کرنے لگے. مجھے بھی پٹنہ جانیکی اجازت ملی میں وہاں سے پٹنہ چلا آیا. اسوقت کا منظر برابر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے. اب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے علم میں تو انہوں نے کام ادھورا چھوڑا، لیکن جس کام کو ادھورا چھوڑا اسکو بھی بہت دور تک پہونچادیا اگر اسمیں بھی کچھ باقی رہ گیا ہے تو اسے ملک کو «اور خاصکر ان لوگوں کو جو اپنے تئیں انکا پیرو مانتے ہیں» پورا کرنا ہے. اگر وہ پورا نہیں کرتے تو ملک کی بدقسمتی اور ان کی بے عملی ہے:-

آٹھواں باب

جرمن جنگ کے زمانہ میں دو بڑے واقعات پیش آئے. جن کا ھندوستان کی تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ھے. ایك واقعہ کا تھوڑا سا ذکر میں کرچکا ھوں. وہ آئینی اصلاحات کا اعلان اور اس سلسلے میں مانٹیگو چمسفورڈ کی رپورٹ کے متعلق سارے ملك میں اختلافات وغیرہ. دوسرا واقعہ «رولٹ کمیشن» کی تشکیل. یہ کمیشن ملك میں باغی جماعتوں کی کارروائیوں کی جانچ کرنے اور ان سے ملك کو محفوظ رکھنے کی تدبیر کیلئے قائم ھوا تھا. اس کا نام اسکے «صدر مسٹر رولٹ» پر تھا کمیشن نے ایك رپورٹ تیار کی اسمیں انقلاب پسند جماعت کی تاریخ کے علاوہ ملك اور بیرون ملك میں جو بغاوت کی کوشش کی گئی تھی. ان کی بھی تفصیل تھی اس کمیشن کی سفارشیں اسی قسم کی تھیں. کہ آئندہ کسی بغاوت کرنے والے کو بغاوت کا موقع نہ ملے. لڑائی کے زمانہ میں

سبھی ملکوں میں دشمن کے جالوں سے بچنے کیلئے ایسے قانون بنادئے جاتے ھیں. ایسے قانون کے ذریعه. عدالتوں کی مداخلت کے بغیر محض شبه پر کسی کو گرفتار کرکے نظر بند کردینے اور اسکے گھر اور جائداد پر قبضه کرلینے کا اختیار حاکموں کو دیدیا جاتا ھے وغیرہ وغیرہ چونکه دشمن سے مقابله رھتا ھے اس لئے لوگ ان باتوں کو برداشت کرلیتے ھیں، جہاں اپنی سرکار رھتی ھے، وھاں ان اختیارات کا استعمال بھی اسحالت میں ھوتا ھے، جب ملک کیلئے ضروری ھوجاتا ھے، اسطرح کا اختیار سرکار ھند کو بھی لڑائی کے زمانه میں ملا تھا، ملک میں اپنی حکومت تو تھی ھی نہیں لھذا ایسے قانون کو، غیر قانونی طور پر بری طرح سے استعمال کیا گیا، خاصکر لڑائی کیلئے چندہ وصول کرنے اور بھرتی کرنے میں بہت ظلم اور زیادتیاں ھوئیں، اسی وجه سے ملک میں بے چینی اور ناراضگی بہت تھی، خاصکر پنجاب میں، جہاں کے بڑے جابر اور زبردست لفٹنٹ گورنر سرمائیکل اوڈائر تھے.

رولٹ کمیٹی کی سفارشیں تھیں که لڑائی کے واسطے وضع کئے ھوئے، اس « قانون حفاظت ملک » کی بری سی بری دفعات کو

بھی مستقل طور سے ہندوستان کے قانون میں جگہ دی جائے، یہ کمیشن لڑائی کے زمانہ میں قائم ہوا تھا، لیکن اسکی رپورٹ شایع ہوتے ہوتے لڑائی ختم ہوگئی. اس وقت گورنمنٹ نے اس کی سفارشوں کے مطابق ایک بل تیار کیا. جو « [1] امپریل لیجسلٹیو کونسل » کے اجلاس میں پیش کیا گیا. گورنمنٹ کی دو عملی بہت زمانہ سے جاری تھی. ایک طرف آئینی اصلاحات کر کے سوراج کے مانگ کرنیوالونکا منھ بند کردینا تھا. اور دوسری طرف زیادہ چیخ پکار کرنے والوں کے ساتھ سختی کرنی تھی. اس اصول کے مطابق ایک طرف اصلاح کی اسکیم منظور ہوئی. تو دوسری طرف « رولٹ بل » بنا. یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ ملک کے سامنے آئیں « اصلاحی اسکیم » کے متعلق تو ضرور ملک میں اختلاف رائے تھا. لیکن « کالے [2] قانونوں » کے متعلق ملک بھر میں کوئی اختلاف نہیں تھا. یہ نام ان « دو بلوں » کا پڑ گیا تھا. جنکے ذریعہ « رولٹ کمیشن » کی سفارشونکو قانونی شکل دی گئی تھی ملک کے اعتدال پسند، انتہا پسند، انقلاب پسند سب کی سب

---

۱ اس زمانہ میں جو اصلاحات سے قبل کا تھا « مرکزی اسمبلی » کا نام و لقب یہی تھا یعنی « شاہی کونسل وضع قانون » اب وہ پارلیمنٹ ہے.

۲ جب یہ رولٹ بل « پیش ہوا تو اسی وقت اسکا نام کالا قانون رکھ دیا گیا.

جماعتیں ان قانونوں کی سخت مخالف تھیں اس زمانہ میں کونسل میں تھوڑے ہی لوگ عوام کی نمائندگی کرتے تھے۔ زیادہ تر سرکاری ملازم اور سرکاری نامزد لوگ ہی کونسل کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ چنے ہوئے نمائندوں میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا۔ جو ان قانونوں کا سخت مخالف نہ ہوتا، سارے ملک میں یہ آواز اٹھی کہ لڑائی جیتنے میں کتنی مدد کی اور اسکا پھل «کالے قانونوں» کی شکل میں گورنمنٹ دے رہی ہے۔ لیکن گورنمنٹ نے کچھ نہ سنا ایسا معلوم ہوا کہ یہ ضرور منظور ہو جائیں گے۔ مہاتما جی کو جو حال ہی میں بیماری سے اٹھے تھے۔ ان بلوں کے پیش ہونے سے بہت تکلیف ہوئی۔ انہوں نے انکی سخت مخالفت کی دوسرے لوگ شاید اپنے بیان دے کر ہی چپ ہو جاتے۔ اور اپنی مخالفت کو کوئی عملی شکل نہ دیتے۔ لیکن گاندھی جی اس طرح چپ بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے سبھی جگہوں پر جلسے کر کے مخالفت کا پروگرام ملک کے سامنے رکھا۔ بہت سے جلسے ہم نے بہار میں بھی کئے، خاص کر پٹنہ میں کئی جلسے ہوئے جن میں بہت سے لوگ شریک ہوئے۔ اس قسم کے جلسے کبھی پہلے ہم نے بہار میں ہوتے نہیں دیکھے تھے۔ نئی بیداری

اور نئی زندگی پیدا ہوگئی تھی.

آخر میں جب سرکار نے کچھ نہ سنا تو انہوں نے یہ تجویز کی کہ اگر یہ قانون پاس ہوجائیں. تو کسی حالت میں نہ مانے جائیں. جو لوگ ایسا کرنے کیلئے تیار تھے انکے نام لکھکر اور ایک عہدنامے پر دستخط کرا کر بھیجنے کی ہدایت کی. چونکہ میں پٹنہ ھی میں رھتا تھا اسلئے بہار میں دستخط کروانے کا کام میرے ھی ذمہ رہا، یہ کہنا مبالغہ نہیں ھے. کہ چمپارن میں جو انکے رفیق کار تھے نہ صرف انہوں نے بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی بخوشی اس عہد نامے پر دستخط کردئے.

یہ پہلا موقعہ تھا کہ گاندھی جی نے ہندوستان آنے کے بعد پورے ہندوستان کے سامنے قانون شکنی کا پروگرام رکھا. اور اس پروگرام میں ایک بڑی مشکل یہ تھی. کہ جو «کالے قانون» بن رہے تھے. اور جنکی مخالفت میں ھی ستیہ گرہ ہونیوالی تھی. انکو آسانی سے نہیں توڑا جاسکتا تھا، کیونکہ ان میں کوئی ایسی چیز فوراً سامنے نہیں آتی تھی، جسکی خلاف ورزی کی جاسکتی، لیکن اس دقت کو گاندھی جی نے اسطرح حل کیا کہ جو عہدنامہ انہوں نے مرتب کیا تھا. اسمیں لکھا گیا تھا. ہر دستخط کرنے

والا ان قانونوں کے علاوہ ہر اس قانون کو بھی توڑیگا جسکے لئے یہ کمیٹی اسکو حکم دیگی. اسلئے کمیٹی کو جسکا نام ستیہ گرہ کمیٹی رکھا گیا تھا. یہ اختیار دیدیا گیا تھا. کہ وہ یہ بتائے کہ کون سا قانون توڑنا ہوگا. سارے ملک میں جوش پھیلا ہوا تھا لیکن بہت سے لوگ جو کالے قانون کے سخت مخالف تھے. ستیہ گرہ یعنی قانون شکنی کا پروگرام پسند نہیں کرتے تھے. یہیں پر یہ صاف ہوگیا کہ گاندھی جی کے اور آجتک کی مروجہ سیاسی تحریک کے طریقہ میں کتنا فرق ہے. آئینی اصلاح کی وجہ سے کانگریس کے اندر جو جو اختلاف پیدا ہوگیا تھا. وہ اس طریق تحریک کی وجہ سے اور عیاں ہوگیا. بہار میں اسکے متعلق اتنا سخت اختلاف نہیں تھا. یہانتک کہ حسن امام صاحب نے عہد نامہ پر دستخط کردئے تھے. اسی سلسلہ میں گاندھی جی نے ایک تاریخ مقرر کردی. جس میں تمام ملک کو روزہ رکھنے سب کاوبار بند کردینے، جلوس نکالنے اور جلسے کرکے مخالفت کی قرار دادیں منظور کرنے کی ہدایت کی انہوں نے بتایا کہ یہ تحریک ملک کے لئے صفائی اور پاکی کی تکمیل کی ہے. اسی کے ساتھ انہوں نے عدم تشدد کی تاکید بھی کی، انہوں نے یہ بھی

کہا ۔ کہ سب لوگ اپنے مذہب کے اعتبار سے اپنی اپنی عبادت گاہوں میں دعائیں کریں ۔ تاریخ کی اشاعت میں کچھ گڑبڑ ہوگئی اسلئے کسی جگہ ایک ہفتہ پہلے اور کہیں ایک ہفتہ بعد دن بتایا گیا ۔

ملک کیلئے یہ ایک نیا پیغام تھا ، اس وقت تک تحریک کی شکل جلسوں میں ، رزولیوشن پاس کردینے اور اخباروں میں مضمون بھیجدینے کی حد تک ھی رھا کرتی تھی ۔ البتہ تقسیم بنگال کے وقت انگریزی چیزونکا بائیکاٹ اور سودیشی کا پرچار بھی کیا گیا تھا ۔ لیکن وہ صرف اسی بنگال تحریک ھی کی حدتک رہا ۔ تقسیم بنگال منسوخ ھوجانے کے بعد اسکو بھی بہت سے لوگ بھول گئے تھے ۔ ھاں جو لوگ تیز اور سخت مزاج کے تھے ، وہ انقلابی جماعت کیساتھ شریک ھوگئے ، انقلابی لوگ انگریزی اور ھندوستانی افسروں کو جو تحریک دبانے میں بہت کام کررھے تھے مار ڈالنے کی کوشش میں تھے ، اس کے لئے وہ بم بناتے اور ادھر ادھر سے پستول لاکر بھی جمع کرتے ، کچھ لوگ خفیہ طور سے انکو رقم دیتے ، ورنہ وہ خود ڈکیتیاں کرکے روپیہ جمع کرتے ، اس گروہ میں خاص طور سے جوان

نوجوان ھی تھے، اسکا اعلانیہ پرچار نہیں ھوتا تھا، بلکہ ھر کام خفیہ طریقہ سے کیا جاتا تھا۔ ملک کی جنتا میں اس کا بہت پرچار نہیں ھو پایا تھا، لیکن جو اسمیں شریک ھوتے وہ دُھن کے بڑے پکے اور جان ھتیلی پر لیکر کام کرتے تھے۔

بہت سے مقدمے بھی ھوئے جن میں بہت سے لوگوں کو پھانسی اور کالے پانی کی اور بعضوں کو لمبی لمبی قید کی سزائیں ملیں، ان میں ایک یہ کمزوری تھی کہ جب کبھی مقدمے چلتے پولس ھر ممکن طریقہ سے ان میں سے کسی نہ کسی کو توڑ کر سرکاری گواہ بنا لیتی۔ مقدمہ چلنے پر کچہریوں میں پیروی کی جاتی اور جہاں تک ھوسکتا بچنے کی تدبیر کی جاتی۔

گاندھی جی نے جو پروگرام بنایا تھا وہ اس سے مختلف تھا۔ ایک تو اسمیں کسی مخالف یا دشمن پر ھاتھ اٹھانے کی ممانعت تھی دوسرے جو کچھ کرنا تھا وہ ایک اعلانیہ طور پر، چھپے چوری نہیں کرنا تھا، اس کے لئے جو بھی سزا ھو اسے ھنسی خوشی برداشت کرنا، «رولٹ بل» کے خلاف ملک میں جتنے جلسے ھوئے، انمیں جتنے لوگ شریک ھوئے اور انمیں جوش و ھمت کے جو خوبصورت منظر دیکھے گئے ان کی مثال نہیں

مل سکتی ، جو لوگ پہلے طریقوں سے مطمئن نہیں تھے اور ان کو بیکار اور بے نتیجہ سمجھتے تھے اور ساتھ ھی انقلابی پروگرام کو بھی پسند نہیں کرتے تھے ، وہ اس نئے پروگرام کو دیکھکر بہت متاثر ہوئے ، ایسا معلوم ھوا کہ ملک کے ھاتھ میں ایک نیا ھتیار گاندھی جی نے دے دیا تھا .

چمپارن سے جانے کے بعد بھی گاندھی جی نے چمپارن سے تعلق رکھا ، ھملوگ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کہیں اس کو کرنا ھی چاھئے ، ان کو بھی بھروسہ تھا کہ وہ جو کچھ کہیں گے بہار کے لوگ اسکو مان لینگے ، اس ستیا گرہ میں ھم نے اپنی ذمہ داری سمجھکر ھی اس کام کو ھاتھ میں لیا تھا . اگر چہ یہ ابھی واضح نہیں ھوا تھا کہ کب اور کس طرح اسکی ابتدا ھوگی پٹنہ میں ۲ اپریل کی ھڑتال ، جلوس اور جلسے ایسے ھوئے کہ بہار میں اس سے پہلے کبھی نہیں ھوئے تھے . صرف پٹنہ نہیں بلکہ بہار کے دوسرے شہروں اور گانوؤں میں بھی یہ دن بڑی شان سے منایا گیا ، شہرونمیں اس روز ایک بھی دکان نہ کھلی اور نہ کوئی سواری چلی ، سارے شہر کے ھندوؤں نے گویا اس دن کو ایک مبارک دن مان کر گنگا اشنان کیا اور

مندروں میں پرارتھنا کی ۔ مسلمانوں مسجدوںمیں دعائیں مانگیں،
دوپہر کو دو ڈھائی میل لمبا ایک جلوس نکلا جس میں سبھی
لوگ ننگے سر اور ننگے پیر شریک ہوئے، پٹنہ میں قلعہ پر
جلسہ ہونے والا تھا لیکن وہ جگہ چھوٹی ثابت ہوئی، لهذا
سب لوگ گنگا کے کنارے ریت پر پھیل گئے، وہیں ایک
بڑا جلسہ ہوا کہ پٹنہ میں اس سے بڑا جلسہ کبھی نہیں ہوا ۔
گاندھی جی کا نام بہار کے دیہاتوں، خاص کر اتر بہار میں
لوگ اچھی طرح جانتے تھے، کیونکہ چمپارن کا معاملہ
گھر گھر پھیل چکا تھا، گاؤں کے لوگوں نے اس دن کام
بند رکھنے کی ھدایت کی ایسی تعمیل کی کہ اس روز دیہاتوں
میں نہ ہل چلے اور نہ بیل گاڑیاں چلیں، سبھی جگہوں پر
لوگوں نے روزے رکھے اور جلسے کئے ۔ یہ خبر جب ہم
لوگوں کو معلوم ہوئی کہ گاؤں میں بھی لوگوں نے یہ دن
منایا تو ہملوگوں کا جوش اور بھی بڑھ گیا، اب اسکی توقع
کرنے لگے کہ آئندہ کیا ھدایات ملتی ہیں ۔

دھلی میں کچھ واقعات ہوجانیکی وجہ سے گاندھی جی احمدآباد
سے دھلی جارہے تھے ۔ دھلی کے قریب پہونچنے پر گورنمنٹ

کے حکم سے وہ گرفتار کر لئے گئے اور کسی جگہ پہنچا دیئے گئے، اسوقت گورنمنٹ نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو کہاں لے جایا جارہا ھے۔ شری مہا دیو بھائی ان کے ساتھ تھے۔ ان کو یہ معلوم نہ ہوا کہ مہاتما جی کہاں لے جائے گئے، اسوقت وہ بمبئی واپس ہوئے اور انہوں نے مجھے تار دیا کہ مہاتما جی کو، دہلی جاتے ہوئے گرفتار کر کے کسی نامعلوم جگہ پر بھیج دیا گیا، اسکے ساتھ ہی انہوں نے مجھے فوراً آنے کے لئے لکھا تا کہ وہیں مل کر صلاح و مشورہ کیا جائے کہ اب کیا کیا جائے؟ میں تار ملتے ہی بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا، میں سمجھ چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہوکر ہی رہے گا اور اب زیادہ انتظار کی ضرورت نہیں ہوگی، راستے میں مجھے کچھ اخبار ملے جن سے یہ معلوم ہوا کہ کئی جگہوں پر بلوے شروع ہو گئے ہیں، پٹنہ سے بمبئی جانے میں تقریباً دو روز ریل میں لگ جاتے ہیں، مجھے یہ خبر بھی ایک روز دیر سے ملی تھی اسلئے میرے بمبئی پہنچتے پہنچتے تین یا چار دن گزر چکے تھے، میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ مہاتما جی کو اور کہیں نہیں لے گئے بلکہ ان کو

بمبئی ھی میں لا کر چھوڑ دیا، ان کی گرفتاری کی خبر سے
بمبئی میں بھی کچھ فساد شروع ھوا تھا لیکن ان کے وھاں
پہنچ جانے پر امن ھوگیا. اور وہ وھاں سے احمدآباد چلے
گئے تھے جہاں سخت فساد ھورھا تھا اس صورت میں بمبئی
میں میرا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا یہ سوچ کر احمد آباد چلا
جاؤں میں اسی دن شام کی گاڑی سے ادھر کو روانہ ھوگیا
مہاتما جی کے وھاں پہنچنے کے بعد وھاں بھی فساد کم ھوگیا
تھا لیکن سرکاری نگرانی اور چوکسی سارے شہر میں دکھائی
دے رھی تھی، کیونکہ پولس اور فوج کے آدمی سزا دے
رھے تھے، اسٹیشن سے سابر متی آشرم پہنچنے میں مجھے
مشکل پیش آئی، لیکن اسٹیشن پر خفیہ پولس نے تانگہ
ٹھیک کر کے میرا کام آسان کردیا، مہاتما جی کے پاس بخیریت
پہنچ گیا، وہ شہر میں سب جگہ اپنے کارکنوں کو بھیج
رھے تھے اور لوگوں کو سمجھا بجھا کر پرامن رھنے کی
کوشش میں لگے ھوئے تھے، شہر میں کافی امن ھو چکا
تھا لیکن پھر بھی لوگوںمیں پرچار کی ضرورت تھی، وھاں کی
حالت سدھارنے ھی اسی روز یا دوسرے روز رات کو

مہاتما جی پھر بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے، مین بھی ان کے ساتھہ تھا اور ریل میں انہیں کے ڈبہ میں بیٹھا، رات کو وہ سوئے نہیں بلکہ کچھہ لکھتے ہی رہے. جو کچھہ انہوں نے لکھا تھا وہ انہوں نے سویرے مجھے پڑھنے کے لئے دیا، اور وہ تحریک ستیا گرہ بند کرنے کا اعلان تھا، ان کی گرفتاری کی وجہ سے جو فسادات دھلی، پنجاب، بمبئی، احمدآباد اور دوسرے بہت سے شہرونمیں ہوئے تھے ان کا اثر ان کے دل پر بہت پڑا، انہوں نے اسوقت ریل ھی میں سوچ لیا تھا کہ ملک نے ان کے طریقہ کو ابھی تک ٹھیک طور سے نہیں سمجھا، اسلئے تحریک کو موقوف کرنا ھی مناسب ہوگا.

جو لوگ ابھی ان کی ستیا گرہ کی حقیقت کو ٹھیک طور سے نہیں سمجھے ہوئے تھے انہوں نے اس پر نکتہ چینی کی اور تحریک موقوف کردینے پر برا بھلا بھی کہا، ابھی تک ستیا گرہ نہ تو کہیں شروع ہوئی تھی اور نہ اسکی ٹھیک طور سے شکل متعین ہوئی تھی، جن لوگوں نے عہد نامہ پر دستخط کئے تھے وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کو

گپ کرنا چاھئے ؟ اسلئے مہاتما جی کا اعلان نکلتے ھی ستیا گرہ کا مسئلہ تو ملتوی ھوگیا لیکن اسی عرصہ میں « جنرل ڈائر » کے ذریعہ سے جلیانوالے باغ اور صوبہ پنجاب میں بلا وجہ قتل و غارت اور زبردست ظلم ھوئے جنکی پوری خبر ملک کو بہت دنوں تک نہ مل سکی ، لیکن خبر ملنے پر سارے ملک میں آگ لگ گئی ، وھی ظلم اور غارت گری سوراج کے متعلق سارے ملک میں تحریک کی بنیاد ڈالنے کا سبب ھوا اسی عرصہ میں خلافت کے متعلق برٹش گورنمنٹ کے رویہ اور اسکی وعدہ خلافی سے مسلمانوں میں بھی زبردست بیداری پیدا کر دی تھی ، جب پنجاب کے قتل و خون اور زیادتیوں کے متعلق گورنمنٹ نے تحقیقات کے لئے « ھنٹر کمیشن » مقرر کیا اور اس کمیشن کے ساتھ کانگریس کا نباہ نہ ھوسکا تو کانگریس کی طرف سے تحقیقات کے لئے ایک علحدہ کمیٹی بنائی گئی جس کے ایک ممبر مہاتما گاندھی بھی تھے ، جب قتل و خون اور زیادتیوں کے مفصل حالات لوگوں کو معلوم ھوئے تو ملک کی بے چینی کا پارہ اور بھی چڑھ گیا ، میں اس زمانہ میں پٹنہ ھی میں رھا ، لیکن اس جانچ

کمیٹی کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ہوا، جب گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کو عدم تعاون کی رائے دی تو اس نے خلافت کے خلاف سرکاری رویہ کی وجہ سے عدم تعاون کا ارادہ کرلیا، گورنمنٹ نے بھی ھنٹر کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے بعد پنجاب کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جو عوام کو مطمئن کرتا، اسوقت کانگریس کے سامنے بھی یہ سوال آیا کہ اب اسکو کیا کرنا چاھئے، اسطرح دونوں کانگریس کمیٹی اور خلافت کمیٹی ایک ساتھ مل کر کام کرنے لگے، دونوں کے سامنے عدم تعاون کا مسئلہ آیا، بنارس میں ایک جلسہ ھوا، وھاں طے پایا کہ کانگریس کا خاص اجلاس اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کلکتہ میں کیا جائے. لالہ لاجپت رائے حال ھی میں بیرونِ ملک سے واپس ھوئے تھے اس اجلاس کے وھی صدر منتخب کئے گئے. ستمبر ۱۹۲۰ع کو اجلاس کرنے کا ارادہ کیا گیا،

عدم تعاون کا جو پروگرام گاندھی جی نے بنایا تھا اسمیں تھا کہ سرکاری خطابوں کو نہ قبول کرنا، کونسل کے لئے زمینداروں کا نہ کھڑا ھونا، ووٹ نہ دینا، سرکاری یا

سرکار سے متعلق اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کرنا یعنی نہ انمیں تعلیم پانا اور نہ اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے انمیں شریک کرنا. سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ کرنا، یعنی نہ انمیں مقدمہ دائر کرنے اور نہ وکالت اور مختاری کرنی، اسی طرح سے یہ چار بائیکاٹ عدم تعاون کے اہم جز تھے، ساتھ ھی بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ. چرخے اور کھدر کا پرچار ملک کی تعلیم جاری اور پنچائتی عدالت قائم کرنا وغیرہ وغیرہ. یہ اس کے تعمیری کام تھے. ملک میں اس پروگرام کا بہت چرچا ہونے لگا.

گاندھی جی نے اخبار «ینگ انڈیا» کی ایڈیٹری اپنے ھاتھ میں لے لی تھی اسلئے ان کے خیالات ملک کو ہفتہوار معلوم ہوجایا کرتے، میں دور سے ھی ان باتوں کو دیکھتا اور سنتا رھا، مہاتما جی سے بھی میری ملاقات کانگریس کمیٹی کے کسی خاص اجلاس میں یا ایسے ھی کسی دوسرے موقع پر ہوتی رھی، لیکن اس کے متعلق خاص طور پر نہ تو میں نے ان سے کچھ جاننے یا پوچھنے کی ضرورت سمجھی اور نہ انہیں کچھ کہنے یا لکھنے کی، میں ان کے مضامین وغیرہ

سے مطمئن ہو جاتا تھا، اسکے دلمیں شاید یہ بھروسہ تھا کہ جب کام کا موقع آئیگا اسوقت بہار کے لوگ ان کے پروگرام کو حتی الامکان پورا کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔

اس موقع پر میرے اسقدر کم تعلق کا سبب یہ بھی تھا کہ سنۂ ۱۹۲۰ کی ابتدا سے ھی میں ایک بڑے مقدمہ میں کام کر رہا تھا، جس میں پنڈت موتی لال نہرو اور دیس بندھو داس بھی تھے، میں نے یہ خیال کرلیا تھا کہ عدم تعاون شروع ہونے پر مجھے شریک ہونا ھی پڑیگا اور اسکے لئے مجھے دو چیزیں فوراً چھوڑنی پڑینگی، ایک وکالت اور دوسری اسمبلی کی امیدواری، نومبر سنۂ ۱۹۲۰ میں انتخاب ہونے والا تھا، میں نے سوچا تھا کہ چمپارن سے کھڑا ہونگا کیونکہ وہاں کے کسان ہملوگوں کو جان چکے تھے میں سمجھتا تھا کہ وہاں سے چنے جانے میں آسانی ہوگی اور میں اس ضلع کے لوگوں کی نمائندگی بھی کرسکونگا، کیونکہ وہاں کے لوگوں کے متعلق خاصی واقفیت ہوچکی تھی لیکن یہ اسی وقت کرنا ہوگا جب کانگریس فیصلہ کردے یہ امید تھی کہ مقدمہ بھی اسوقت تک ختم ہوجائیگا اسلئے میں

بہرحال اپنا کام کرتا رہا.

اگست کے مہینے میں صوبۂ بہار کی «پولیٹکل کانفرس» کا اجلاس بھاگلپور میں ہونیوالا تھا، اسکا صدر لوگوں نے مجھ ھی کو بنایا تھا اسکو ملک کے سب سے بڑے مسئلے اور اور عدم تعاون کے پروگرام پر غور کرنا تھا لوگوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں عدم تعاون کا طرفدار ہوں مجھکو صدر بنایا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ «کانفرنس» اس پروگرام کو مانے گی یا نہیں، ابھی تک ملک کے کسی صوبہ نے اسکے متعلق اپنی رائے نہیں دی تھی میں ھچکچاتا تھا، لیکن بابو برجکشور وغیرہ کے زور دینے پر مین نے صدارت منظور کرلی، «شری سچدانند سنہا» جیسے بزرگ رہنماؤں سے بھی پوچھ لیا تھا انھوں نے بہت دل سے میرا صدر ہونا پسند کیا اور یہ رائے بھی کہ اگر تمہارا خیال عدم تعاون کی موافقت میں ھے تو تم اسکو کانفرنس کے سامنے صاف صاف ظاہر کردینا اور آخری فیصلہ کانفرنس پر چھوڑ دو. میں نے ایسا ھی کیا اور اپنی تقریر میں خلافت اور پنجاب کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ عدم تعاون کا

پروگرام ایک طرح سے اسوقت تک لازمی ھے جب تک برٹش گورنمنٹ حقیقی انصاف نہ کرے، اسکے علاوہ کچھ اپنے صوبہ کی جو ضروری باتیں تھیں ان کا بھی ذکر تھا، یہ کانفرنس کانگریس کے خصوصی اجلاس سے چند روز پہلے ھی ھوئی میں جہاں تک جانتا ھوں یہ پہلی ھی کانفرنس تھی اور پہلا صوبہ تھا جس کے نمایندوں نے عدم تعاون کی تائید میں باضابطہ قرار داد منظور کی. قرار داد کی ترتیب اور غور کے وقت عدم تعاون کے اسباب میں بابو برجکشور پرشاد نے پنجاب کے واقعات اور خلافت کے متعلق شکایت کے علاوہ حصول سوراج کو بھی شریک کرا دیا، یہ اسوقت خاص کر ھمکو کھٹکا، ابھی تک ھم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ یہ عدم تعاون تھوڑے ھی دنوں کے لئے ھوگا جس طرح چمپارن کا کام پورا کر کے ھم اپنے اپنے دھندے میں لگ گئے ویسے اسکو بھی پورا کرلینگے اور پنجاب اور خلافت کے متعلق انصاف کرا کے اپنے اپنے دھندوں میں لگ جائینگے، ھم یہ نہیں جانتے تھے کہ سوراج لینا بہت مشکل ھے جس کے لئے ایک بار عدم تعاون شروع کر دینے کے

بعد شاید ساری زندگی عدم تعاون ھی میں گذارنی پڑے، اسکے لئے کانفرنس سے پہلے تک میں نے سوچا ھی نہیں تھا اور نہ اسکے لئے تیار تھا لیکن جب کانفرنس نے یہ تجویز منظور کرلی تو اسکی تکمیل چاھے جتنا وقت لگے اسوقت عدم تعاون جاری رکھنے کا عزم و ارادہ کرنا ھی پڑیگا۔

بہت دنوں بعد جب گاندھی جی سے اسکے متعلق بات چیت ھوئی تو انہوں نے سمجھا دیا کہ دیکھنے میں خلافت اور پنجاب کی باتیں اگرچہ چھوٹی معلوم ھوتی ھیں لیکن پھر بھی برٹش گورنمنٹ ان کو اسوقت تک نہیں مانے گی، اور نہ ھماری خواھش کے مطابق انصاف کرے گی۔ جب تک وہ ھمارے ھاتھوں میں اختیارات سونپنے کے لئے تیار نہ ھوگی اسلئے حصول سوراج کے مسئلے کا اضافہ کردینے سے ھم نے اپنے مطالبہ کو برٹش گورنمنٹ کے لئے زیادہ مشکل نہیں بنایا ھے بلکہ اپنے اور ملک دونوں کیلئے اسے زیادہ جامع اور قابل عمل بنایا دیا۔ اسوقت میں محترم برجکشور بابو کی دور اندیشی اور عملی قابلیت کا اور بھی قائل ھوگیا۔

بہار کانفرنس کے بعد اور کانگریس کے اجلاس خصوصی

کے پہلے ہی گجرات میں صوبائی کانفرنس ہوئی، اس نے بھی عدم تعاون کی تائید کی. میں کلکتہ میں مخصوص اجلاس میں شریک نہ ہو سکا. ٹھیک اسی زمانہ میں اس بڑے مقدمہ کی بحث چل رہی تھی جس میں ہمارے فریق کی طرف سے پنڈت موتی لال نہرو بحث کرنیوالے تھے لیکن اسوقت کلکتہ کے دوسرے بیرسٹر مسٹر نوبندر ناتھ سرکار جو بعد میں ایڈوکیٹ جنرل اور وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہوئے اور سر این این سرکار کے نام سے مشہور ہوئے، بحث کر رہے تھے، اور میں ان کی مدد کر رہا تھا دیس بندھو داس اس دوسرے فریق کی طرف سے بعد میں بحث کرنے والے تھے لیکن وہاں جو کچھ فیصلہ ہوا اس سے میں پورا متفق تھا کیونکہ وہی فیصلہ انہوں نے بہار کانفرنس میں کرلیا تھا، اب یقین ہو گیا. میرے لئے اب شاید یہ آخری مقدمہ ہوگا. کلکتہ اجلاس کے کچھ عرصہ بعد تک مقدمہ کی بحث چلتی رہی، لیکن اکتوبر کے مہینے کے شروع ہوتے ہی مقدمہ سے فرصت مل گئی. اب میں عدم تعاون کے کام میں لگ گیا. کانگریس کے اجلاس کے بعد بھی

«آل انڈیا کانگریس کمیٹی» کی نشست ہوئی جس میں عدم تعاون کے متعلق پرچار کا فیصلہ کیا گیا میں پنڈت موتی لال جی نہرو کے ساتھ ہی گیا تھا وہاں جو پروگرام پیش و منظور ہوا، ہم واپس آ کر اسی کے مطابق کام کرنے لگے۔

نواں باب

نومبر سنہ ۱۹۲۰ میں نئے آئین کے موافق کونسلوں کا انتخاب ہونے والا تھا۔ کلکتہ کانگریس کے بعد کانگریس والے سب ہی جگہوں کی امیدواری سے دست کش ہوگئے، میں نے تو اس سے پہلے ہی خیال چھوڑ دیا تھا۔ اس کے متعلق اخباروں اور جلسوں کے ذریعہ خوب پرچار کیا گیا۔ لوگوں کو ووٹ دینے سے بھی منع کیا گیا۔ بہار میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔ باوجودیکہ امیدواروں کے بغیر کوئی جگہ خالی نہیں رہی۔ لیکن پھر بھی ووٹ دینے والے بہت ہی کم شریک ہوئے۔ ایک تو اس قسم کا یہ پہلا انتخاب تھا۔ اس لئے کم ہی لوگ اس میں ووٹ دیتے۔ دوسرے جو ووٹ دیتے کانگریس کے پرچار سے ان میں سے بہت ہی کم شریک ہوئے۔ اس لئے جب کبھی کونسل کے ممبر کے

متعلق کوئی بات چیت ہوتی تھی۔ تو یہ سچائی کے ساتھ کہہ دیا جاتا تھا۔ کہ یہ لوگ ملک کے سچے نمایندے نہیں ہیں لیبرل جماعت کے لوگوں سے کانگریس کا اس جگہ اعلانیہ اختلاف ہوگیا۔ ان لوگوں نے صرف انتخاب ہی میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ انتخاب کے بعد نئے قانون کے اعتبار سے جو وزارت بنی اسمیں بھی آ کر شریک ہوگئے۔ اسطرح وہ نئے آئین کو کامیاب بنانے میں۔ جہاں تک ان سے ہوسکتا تھا۔ کوشش کرنے لگے۔ اگرچہ کانگریس کے مخصوص اجلاس میں عدم تعاون کا پروگرام منظور ہوچکا تھا۔ پھر بھی ایک بڑی جماعت تھی جو اس کو منظور نہیں کرتی تھی۔ وہ جماعت کانگریس کے سالانہ اجلاس کا۔ جو ناگپور میں ہونے والا تھا۔ اسلئے انتظار کر رہی تھی۔ کہ وہاں اسکو نامنظور کرا دیا جائیگا۔ بات یہ ہے کہ اس پروگرام کو لوگ پوری طرح سمجھتے نہین تھے۔ اسلئے اسکو بیکار مانتے تھے۔ یہ اکثر سننے میں آتا تھا کہ اس سے برٹش گورنمنٹ پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ اسکے ساتھ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ لوگ اسکو نہیں مانیں گے۔ اور اگر مان بھی لینگے تو کئی طرح سے انہیں

کا نقصان ھوگا۔ برٹش گورنمنٹ کا نہیں۔ اسی خیال کی بنیاد پر کہا جاتا تھا کہ سارا پروگرام نا کام ھوگا۔

سرکاری خطابوں کو چھوڑنے کے متعلق کہا جاتا تھا۔ ایک تو یہ کہ یہ خطابات جن لوگوں کو دئے گئے ھیں۔ وہ اس جماعت سے متعلق ھیں۔ جو کانگریس سے تقریباً ھمیشہ الگ ھی رھی۔ وہ اس بات کو نہ مانیں گے۔ دوسرے اگر کچھ ایک دو آدمیوں نے اپنے خطاب واپس بھی کر دئے۔ تو اس سے برٹش گورنمنٹ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اصل یہ ھے کہ سارے پروگرام کی تہہ میں یہ بات رکھی تھی۔ کہ یا تو اس سے برٹش گورنمنٹ کا رعب و دبدبہ اس ملک میں کم ھوجائے یا جو لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے گورنمنٹ پر بھروسہ کرتے ھیں وہ اسے چھوڑ کر اپنے اوپر بھروسہ کرسکیں۔ لوگوں کے دلوںمیں جو دھاك بیٹھی ھوئی ھے۔ وہ کسی طرح کم ھوجائے۔ اور وہ پوری بے باکی سے آزادی پر غور کرنا سیکھیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے منہ موڑ کر جنتا کی طرف رخ کریں۔ یہ صحیح ھے کہ خطاب تھوڑے ھی لوگوں نے چھوڑے۔ لیکن جنتا میں جو ان کے خلاف پرچار ھوا

اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں جو ان کی عزت تھی - وہ گھٹ گئی ، اسکا مطلب یہ نہیں کہ کسی کے دل میں خطابوں کی عزت نہیں رہی ، یا ان کو حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا. کچھ لوگ تو ایسے تھے ہی ، جو ان کی عزت کرتے رہے ، اور ان کے حاصل کرنے کی خواہش کی وجہ سے گورنمنٹ کو خوش کرنے کی کوشش میں لگے رہے ، لیکن عوام میں ان کے بارے میں مخالفت نہیں تو حقارت کا جذبہ ضرور پیدا ہوگیا تھا ، کہیں کہیں تو خطاب یافتوں کے ساتھ لوگوں نے بدسلوکی بھی کی ، لیکن یہ بدسلوکی پروگرام کا جز نہیں تھی ، پروگرام تو صرف اتنا ہی تھا . کہ برٹش گورنمنٹ کے دئے ہوئے اعزاز کو لوگ اعزاز نہ سمجھیں . اس مسئلہ میں پوری کامیابی ہوئی ، میرا خیال ھے کہ عدم تعاون کے پروگرام کے دوسرے اجزاء سے زیادہ اسی میں کامیابی ہوئی ، کیونکہ اور باتوں کے متعلق بعد میں کچھ اختلاف رائے بھی ہوا ، لیکن اسکے متعلق کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ، خطاب یافتہ لوگوں کے لئے روز بروز جذبۂ حقارت بڑھتا ہی گیا .

کونسلوں کے متعلق بہت اختلاف تھا، کیونکہ سیاست سے تعلق رکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ کونسلوں میں میں شریک اور وزیر ہو کر، اگر ہم جنتا کی بھلائی نہ کر سکیں گے، تو کم سے کم کونسلوں میں رہ کر برٹش گورنمنٹ کی نیش زن چالوں سے ملک کو کسی حد تک بچاسکیں گے لیبرل جماعت و نیز دوسری جماعتوں کے لوگ، یا وہ جو کسی جماعت میں نہیں تھے، پہلے خیال کے تھے، یہی لوگ پہلے انتخاب اور انتخاب کے بعد وزارتوں میں شریک ہوئے، جو لوگ کانگریس میں رہ گئے تھے. وہ یہ کہتے تھے کہ انتخاب میں اگر کوئی حصہ نہ لیں اور کونسلوں کی کرسیاں سب کی سب خالی رہ جائیں. تو ہم اسطرح کے بائیکاٹ کو ایک طرح سے کامیاب مان سکتے ہیں. لیکن ایسا نہ اس انتخاب میں ہوا اور نہ آئندہ ہوسکتا تھا، اس لئے جب ملک کے کچھ لوگ منتخب ہوکر، خواہ وہ کتنے ہی کم ووٹوں سے سہی، کونسلوں کی جگہوں کو بھر دیں گے اور وہاں کام کریں گے تو اسوقت گورنمنٹ کہہ سکے گی کہ بائیکاٹ تو نہ ہوسکا، اور دنیا بھی اسی بات کو مانے گی، اسلئے کونسلوں

کے انتخاب میں حصہ لیکر اس قسم کی اصلاح کو کام میں لانے والے لوگوں کو ھرا دینا چاھئے۔ اسی وقت اپنی مرضی کے مطابق کام کر کے دنیا کو دکھا سکینگے۔ کہ یہاں ملک کے سچے نمائندے ہم ھیں۔ لیکن اس دفعہ کا انتخاب ھو چکا تھا اور اب جب تک تین سال کے بعد دوسرا انتخاب نہ ھو۔ اسکی کچھ اھمیت نہیں ھے۔ لیکن آئندہ چل کر اسکے متعلق آپس میں بڑا اختلاف ھوگیا.

وکالت اور بیرسٹری چھوڑنے اور عدالتوں سے عدم تعاون کرنے کے متعلق بھی زیادہ بحث نہیں رھی۔ کیونکہ اگر کوئی اسکو نہ چھوڑتا اور اسکی مخالفت کرتا۔ تو جنتا خود یہ سمجھ لیتی کہ اسکی ساری بحث خود غرضی کی وجہ سے ھے۔ چونکہ یہ خود وکالت چھوڑنے پر آمادہ نہیں ھے۔ اسلئے اس پروگرام کی مخالفت کر رھا ھے۔ بہت بڑے بڑے لوگوں نے کام چھوڑنے کے بعد ھی اس پروگرام میں حصہ لینا مناسب سمجھا اسکا ایک تو یہ نتیجہ ھوا کہ تمام ملک میں بہت سے لوگ جو پہلے سے پبلک کام کیا کرتے تھے یا جن کو لوگ وکالت مین شہرت کی وجہ سے جانتے تھے۔ اپنا سارا وقت

دے کر عدم تعاون کے کام میں لگ گئے۔ اسکا جنتا پر بہت
زیادہ اثر ہوا۔ اسوقت تک سب لوگوں پر یہ بات واضح نہیں
تھی کہ کتنے دنوں تک کے لئے اپنا پیشہ چھوڑنا ہوگا۔ بہت
سے لوگ تو جوش میں ھی آ کر شریک ہوگئے تھے۔ مہاتما
جی نے کہدیا کہ ملک نے اگر پروگرام کو پورا کر دیا۔ تو
ایک سال میں ہم سوراج لے سکتے ھیں۔ بہت سے لوگوں
نے یہ سمجھ لیا کہ یہ پروگرام صرف ایک سال کے لئے
ھے۔ ایک سال کے بعد تو سوراج ہو ھی جائیگا۔ اسوقت
خاص طور سے کچھ کرنا کرانا نہیں ہوگا۔ لوگ مہاتما جی
کی شرط کو بھول گئے اور سوچنے لگے کہ ۱۹ دسمبر
۱۹۲۱ع تک تو سوراج مل ھی جائیگا۔ اسلئے بہت سے لوگ
جو جوش میں وکالت چھوڑ کر آئے تھے سنہ ۱۹۲۱ کے
بعد آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے پھر وکالت کرنے لگے۔
اسمیں ان کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں تھا۔ کیونکہ بال بچوں
کی پرورش کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہ تھا۔ ان کی اپنی
اور ان کے گھر والوں کی زندگی ایسی بن گئی کہ وہ کوئی
دوسرا کام کر کے گذر کر بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر بھی

کچھ تو همیشه کے لئے اس کام میں رہ هی گئے - اور بہت سے لوگ جو اسوقت واپس چلے گئے تھے - سنہ ۱۹۳۰ میں پھر موقع آنے پر شریک هوگئے۔

اس پروگرام میں عوام نے عدالتوں میں جانا نہیں چھوڑا کیونکہ آخر میں کسی طرح کا نقصان پہنچتے هی عدالت کی پناہ لینی ضروری هو جاتی ہے، لوگ خاتمہ پر نقصان برداشت نہیں کر سکتے تھے، ساتھ هی بے ایمان لوگ اس بائیکاٹ سے ناجائز نفع اٹھا کر عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے والوں کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے تھے، تو بھی ایک سال تک عدالتوں کا بائیکاٹ چلتا رہا - جو آمدنی سرکار کو عدالتوں کے ذریعہ هوتی تھی، اسمیں خاصی کمی آ گئی، ایک سال کی بات مان کر بہت سے لوگوں نے اپنے دعوے ملتوی کر دئے کہ ایک سال بعد دیکھا جائیگا، جہاں پبلک میں زیادہ جوش تھا، وهاں پنچایتوں کا کام کچھ دنوں تک بہت اچھی طرح سے چلا، دونوں فریق کے لوگ پنچایتوں کے فیصلہ کو مان لیتے اور ان کے مطابق کام بھی کرتے تھے، لیکن کہیں کہیں ایسا بھی دیکھا گیا کہ ان پنچایتوں کے سامنے ایسے

ایسے دعوے بھی پیش کر دئے جاتے، جن کی سماعت کبھی عدالت میں بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر پنچائت کچھ نہ کر پاتی تو وہ لوگ اسکی شکایت کرتے، بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ عدالتوں کا دبدبہ بھی بہت کم ہوگیا. وکالت کا پیشہ جس کی بڑی عزت تھی، کچھ دنوں کے لئے کم سے کم اگر اس کا بائیکاٹ نہیں ہوا تو ذلیل ضرور ہوگیا تھا.

سرکار اور سرکار سے تعلق رکھنے والے اسکولوں کے مسئلہ میں سب سے زیادہ اختلاف رہا۔ اس پروگرام کی تہہ میں یہ بات تھی کہ انگریزی تعلیم نے ملک کے تصورات کو یکبارگی بدل دیا ھے۔ صرف خیال ھی نہیں بلکہ دماغ بھی بدل گئے ہیں، ذریعہ تعلیم انگریزی ہونے کی وجہ سے اپنی زبان کے ساتھ لوگوں کا تعلق بھی چھوٹ گیا، اسکے ذریعہ سے برٹش نے ہمارے اوپر صرف سیاسی سیادت ھی نہیں بلکہ دماغی اور اخلاقی سیادت بھی قائم کردی۔ تعلیمی نصاب بھی ملک کی خواھش کے اعتبار سے نہیں بنایا گیا۔ اس میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ھے کہ ان درسگاھوں کے ذریعہ سے برٹش کاروبار چلانے کے لئے ہندوستانی کلرک

تیار کر لئے جائیں۔ جیسا کہ میکالے نے سوچا تھا کہ تعلیم کے ذریعہ سے ایسے لوگ تیار کئے جائینگے جو شکل و صورت میں ہندوستانی رہتے ہوئے اندر سے انگریزیت سے بھرے رہیں گے۔ اس لئے جب تک یہ طریقہ نہ بدلا جائے دماغی غلامی نہیں جاسکتی۔ اور اگر دماغی غلامی نہ چھوٹی تو سیاسی غلامی بھی دور نہیں ہوسکتی، مگر مروجہ طریقہ کے خلاف یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگرچہ اتنے دنوں سے انگریزی تعلیم دی جارہی ہے، مگر پھر بھی قدیم زمانہ میں علم کے ذریعہ دنیا کو جو یوروپ کی دین ہے، خاص کر اس علم کی اصلی شکل کو یہاں کے تعلیمی طریقہ میں بہت کم مقام دیا گیا، کیونکہ برٹش راج چلانے کے لئے ہندوستانیوں میں اس علم کی اتنی ضرورت نہیں تھی، ممکن ہے کہ یہ بھی خیال کیا گیا ہو کہ اگر ہندوستانی اس میں کامل ہو جائینگے تو یوروپ اور خصوصاً انگلینڈ کے صنعتی پیشوں میں بھی مقابلہ کرنے لگ جائینگے۔

اس پروگرام کی مخالفت میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگر ان علمی اعزازوں کو جن کا تعلق گورنمنٹ سے تھا، چھوڑ

دیا جائے، تو تعلیم کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں رہ جاتا، اگر اس پروگرام کو پورا کر لے تو بچوں کو جاہل ہی رہنا پڑیگا. کچھ لوگ اس بات کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ انگریزوں نے تعلیم ہی کے ذریعہ ہم پر اخلاقی اور دماغی سیادت حاصل کی ہے، مجھے یاد ہے کہ «اڑیسہ» میں میں مہاتما جی کے ساتھ سفر کر رہا تھا، ایک جاسہ میں کسی نوجوان دوست نے یہ سوال کر دیا کہ آپ اس تعلیم کی کیوں اتنی برائی کرتے ہیں، کیا اس تعلیم سے «لوکمانیہ تلک» اور آپ جیسے لوگ نہیں پیدا ہوئے. کیا یہ ساری تحریک سوراج اسی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے؟ مہاتما جی نے اس کا بڑا اچھا جواب دیا اور انہوں نے کہا کہ میں اپنے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن «لوکمانیہ تلک» کا جو نام لیا گیا ہے تو کون کہہ سکتا ہے؟ کہ ان کا دماغ اگر انگریزی تعلیم کے بوجھ سے دب نہ گیا ہوتا اور دیسی زبان کے ذریعہ سے اسے پھلنے پھولنے کا موقع ملتا تو وہ اور کہاں تک پہنچ جاتا، مثال میں انہوں نے کہا اگر غور کر کے دیکھا جائے تو «لوکمانیہ تلک» بہت بڑے آدمی

ہونے پر بھی آج کی دنیا کے لئے تبلیغی اور ترقی کے ذرائع ہوتے ہوئے بھی اتنا مضبوط و مستقل و وسیع پیمانہ پر کام نہیں کر پائے جتنا پرانے زمانے کے شنکر اچاری یا حال کے تلسی داس اور کبیر داس کر گئے ہیں، اور جن کے اعمال آج ہر گھر میں رائج ہیں، سوراج کے متعلق جو تحریک ہوئی ہے وہ اور بھی کہیں زیادہ زور دار ہوتی، اگر ملک ان دماغی بندھنوں سے نجات پائے ہوئے ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ہم ابھی تک جو کچھ کرتے آئے ہیں، ایک طرح سے یوروپ کی نقل ہے، ہماری جو حالت ہے اسمیں ہم کو اپنا راستہ نکالنا ہوگا اور وہی نرالا ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس پروگرام کو بھی مان لیا تھا، اس کے مطابق اپنے گھر کے بچوں کو سرکاری سکول اور کالج سے ہٹا لیا تھا، انہیں پھر کبھی وہاں نہ جانے دیا، اسکا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ وہ آج سوراجی سرکار کے دفتروں میں بھی کسی یونیورسٹی کی چھاپ (ڈگری) نہ رہنے کی وجہ سے کوئی نوکری چاہیں بھی تو نہیں پاسکتے، لیکن میرے دل میں کچھ نہ کچھ شک ضرور پڑ گیا تھا، وہ شک مندرجۂ بالا گفتگو

سننے کے بعد بالکل دور ہوگیا ۔ اس سے پہلے بھی میں نے ملکی تعلیم کی تبلیغ میں حصہ لینا پوری طرح شروع کر دیا تھا ۔ بہار میں « مہا ودّیالیہ » ملکی « ودّیا پیٹھ » اور بہت سے مدرسے اور مکتب قائم کرنے اور کرانے اور ہزاروں طالب علموں کو سکول اور کالج چھوڑ دینے میں پوری مدد بھی دی تھی ، لیکن دل و دماغ کے ایک کونے میں شک و شبہ کی تھوڑی سی مقدار اپنا مقام رکھتی تھی ؛ وہ اڑیسہ ہی میں دور ہوئی ۔ اب جتنا سوچتا ہوں مہاتما جی کی اسکے متعلق دور اندیشی اور گہری سمجھ کا اپنے تئیں قائل مانتا ہوں ۔ آج ہمیں سوراج حاصل ہے ۔ اور ملک کی قسمت ہمارے ہاتھوں میں ہے ، پھر بھی ہم اپنی تعلیم اور دماغی بندھن کی وجہ سے یوروپی اثر سے اب تک الگ نہیں ہوسکے ہیں آج بھی ہمارے سامنے چیزوں کے ناپنے کے لئے کوئی ترازو اگر ہے تو وہ یوروپی ترازو ہے ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کو خوامخواہ کوئی دوسری ترازو رکھنا چاہئے ۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ آج تک ہم اتنے بندھے ہوئے ہیں کہ دوسری ترازو کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتے ۔ مثال کیلئے

آئین کی بات لے لیجئے کہ آج ہم کو پورا اختیار ہے کہ ہم جو آئین بنانا چاہیں وہ بنا سکتے ہیں. لیکن ہم نے جو مسودہ تیار کیا ہے اس میں مغربی قوانین کی ہی نقل ہے، اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکیں کہ دنیا کے سامنے ہم یہ ایک نئی چیز پیش کر رہے ہیں، ایک ہی مسئلہ کو لے لیجئے، ہم اہل ملک کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم نے یہ سوچا ہے کہ بالغ رائے دہی ضروری ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قانون میں جاہل اور عالم، سادھو اور چور، خوش چلن اور بد چلن ان سب کی عقلوں کی ایک ہی قیمت ہے، صرف یہی نہیں بلکہ جو نمائندے منتخب ہوکر ہماری لیجسلیٹو کونسلوں (قانون ساز کونسلوں) میں بھیجے جائیں گے- اور جن پر ملک کی حکومت کا بوجھ ہوگا، ان میں بھی کوئی خصوصیت نہیں ہونی چاہئے، کوئی آدمی خواہ کتنا ہی ناقابل کیوں نہ ہو، وہ ناقابلیت چاہے جہل کی وجہ سے ہو یا بدچلنی کی وجہ سے وہ منتجب ہونے اور جنتا کی نمایندگی کا حق رکھتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی ترقی ہو، اس میں رونق ہو

لیکن کیا اس کے لئے علم اور کردار دونوں کی ضرورت نہیں؟ اور اگر ھے تو اس کے لئے ہم قانون میں کوئی جگہ نہیں دے رھے ھیں کیوں کہ مغربی قوانین میں اسکی کوئی مثال نہیں ملتی، اگر ہم کوئی چیز ایسی نکالتے ھیں، جن میں علم اور کردار بلکہ علم سے بڑھکر کردار کو ملکی حکومت میں اگر خاص مقام ملتا تو یہ ھماری ایک دین ھوتی، ابھی تک ہم کچھ نہیں سوچ پائے ھیں، کیونکہ ھمارے دماغ جدید تصورات سے جو مغربی تصورات کے عکس ھیں اتنے زیر اثر اور دبے ھوئے ھیں کہ ان کے باھر ھماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں، ھمارے خیالات وھاں تک پہنچ نہیں سکتے، اس میں ھمارا قصور نہیں ھے کیونکہ یہ ھماری تعلیم کا پھل ھے۔

ایک دوسری چھوٹی سی بات لے لیجئے۔ آپ جہاں کہیں جاتے ھیں وھاں یہی دیکھتے ھیں کہ لوگ اس زمانے کی ھی باتیں کیا کرتے ھیں۔ مثلاً کوئی مصنف اور شاعر ھے۔ تو اس کو یا تو ترقی پسند یا قدامت پرست کا لقب دے دیا جاتا ھے، اسی طرح سے کوئی سیاسی میدان میں کام کرنے والا

ھے تو اسے ترقی پسند یا قدامت پرست یا آزادی پسند کہا جاتا ھے اور اگر کچھ غور کر کے دیکھا جائے تو یوروپی تصورات سے جو لوگ متفق نہیں ھیں وہ ترقی پسند و تجدد پسند نہیں ھیں وغیرہ مطلب یہ ھے کہ رفتار زمانہ کی ترازو ہم نے وھی مان لی ھے جو یوروپ نے مانی ھے۔ جتنے اختلافات وغیرہ یوروپ کے تصورات میں پیدا ہوتے ھیں ان سب کا اثر ھمارے خیالات پر بھی پڑ گیا ھے۔ اس لئے ھندوستان کے قدیم تصورات تو سب کے سب پرانے ھی ھیں لیکن جو یوروپی ترازو سے ترقی پسند بھی ھیں ان میں بھی اختلافات ھیں۔ یعنی کوئی ترقی پسند اور کوئی قدامت پسند۔ کیا رفتار زمانہ کے معلوم کرنے کی کوئی دوسری ترازو نہیں اور اگر ھوسکتی ھے تو کیا ھم اسے ماننے کے لئے تیار ھیں۔ ھماری تعلیم ھی ھم کو نااھل بنا دیتی ھے اس لئے ھم دوسری ترازو کام میں نہیں لاسکتے۔

دسواں باب

ناگپور کانگریس سے پہلے مہاتما جی نے علی برادران کے ساتھ دورہ شروع کیا۔ کونسل کا کام ہوچکا تھا۔ اب خاص کر کالجوں سے طالب علموں کے نکالنے ہی کا کام جاری تھا۔ وہ جہاں جاتے تھے وہاں عدم تعاون کی سب ہی باتیں بتاتے۔ اسی دورے میں سب سے پہلے لوگوں نے ان کو دیکھا۔ جو آئندہ چل کر گاندھی جی کے ساتھ سب ہی سفروں میں دیکھنے میں آئے۔ بہت بڑے بڑے جلسے۔ راستے میں لوگوں کا ہجوم۔ ایک ایک دن میں کئی کئی جلسے وغیرہ۔ دسمبر میں بہار بھی وہ پہنچے کئی اضلاع میں گئے میں ان کے ساتھ تھا۔ اس وقت انہوں نے قومی اسکول کھولنے کی ہدایت کی۔ پٹنہ میں قومی اسکول کھولا گیا بہار میں بڑی ہلچل تھی۔ ایک دن سرکاری پٹنہ کالج کے

بہت سے طلباء نکل کر ہمارے پاس چلے آئے۔ ان کو لے کر مہا ودیالیہ کھول دیا گیا۔ اس سے چند دن پہلے ہی انجینیرنگ اسکول کے طلباء اسکول چھوڑ کر اور جلوس بنا کر مظہرالحق صاحب کے گھر پہونچ گئے تھے۔ جہاں آج صداقت آشرم ہے وہاں ان دنوں آس پاس دور تک کوئی بستی نہیں تھی۔ سڑک کے کنارے آم کے باغ ہی تھے۔ جو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ رات میں وہاں آنا جانا خطرہ سے خالی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انہیں میں سے ایک باغیچہ میں ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے مالک کو مظہرالحق صاحب جانتے تھے اس سے اجازت لے کر وہ لڑکوں کے ساتھ وہیں جا کر رہنے لگے۔ اس طرح صداقت آشرم کی بنیاد پڑی۔ ہم لوگوں نے چمپارن میں اسکول کھولنے کے لئے کچھ روپے جمع کئے تھے میں اوپر بتا چکا ہوں کہ گاندھی جی نے ہمارے کالج کھولنے کی تجویز کو ناپسند کر دیا تھا۔ اسلئے کام بند ہو گیا تھا لیکن روپے ابھی پڑے ہوئے تھے۔ انہیں روپوں سے اور کچھ نوجوان جوشیلے لوگوں کو ساتھ لیکر جو قومی مدرسے میں کام

کرنے کے لئے تیار تھے ہم نے قومی مہا ودیالیہ کھول دیا تھا۔ اس میں پرانے طریقہ سے تقریباً انہیں مضمونوں کو جو سرکاری کالجوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ ہم نے بھی پڑھانا شروع کردیا۔ اس بات پر لوگوں کا زور تھا کہ ہم کو ودیالوں میں امتحان لینا چاہئے ان کا کہنا تھا کہ بہت سے طالب علم جو اسکول اور کالجوں کو چھوڑ کر نکلے ہیں۔ اپنے لئے امتحان کا انتظام نہ دیکھکر مایوس ہوجائینگے اس لئے ہمکو اسکول اور کالج بھی کھولنے چاہئیں اور ساتھ ہی امتحان لینے اور ان سب کو ایک ساتھ اور متحد کرنے کیلئے امتحان لینے والی یونیورسٹی جیسی درسگاہ بھی کھول دینی چاہئے۔ میں اس مسئلہ میں کچھ زیادہ پرجوش نہیں تھا میرے دل میں ڈر ہوتا تھا کہ اتنے لوگ جو تقریباً جوش کی لہر میں بہہ کر اسکول اور کالج چھوڑ رہے ہیں۔ ایک تو وہ بہت دنوں تک ٹھہریں گے نہیں۔ دوسرے ہم ان کیلئے کافی انتظام بھی نہیں کرسکیں گے۔ ہمارے مدرسوں میں پڑھے ہوئے طالب علموں کو نوکریاں بھی نہیں ملیں گی آئندہ چل کر یہ ایک بڑا مسئلہ ہو جائیگا۔ اسلئے اگرچہ میں نے

پروگرام کو مان لیا تھا اور اس کے مطابق کام بھی کرنا شروع کردیا تھا لیکن پھر بھی وہ پورے اعتماد کے ساتھ نہین تھا.

جب گاندھی جی پٹنہ آئے تو ان سے میں نے اسیوقت کہدیا تھا کہ مدرسہ تو کھل گیا اور کچھ دنوں تک اس کو چلا لیجانے کیلئے ھملوگوں کے پاس رقم بھی موجود ھے، لیکن اسکے بعد رقم کی دقت ھوگی اسلئے میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کہاں سے رقم جمع کرسکوں گا - گاندھی جی نے اسی وقت کہا تھا کہ رقم کیلئے کچھ فکر نہ کرو - کہیں نہ کہیں سے آھی جائیگی - کام ٹھیک طرح سے چلنا چاھئے - ابھی تک پبلک کاموں کیلئے بہار میں چندہ سے بہت روپے جمع نہیں کئے گئے تھے - میں نے بھی کسی کام کیلئے چندہ جمع کر کے بہار میں کوئی کام نہیں کیا تھا لیکن مجھے دو ایک باتیں معلوم تھیں جن سے میں بہت ڈرتا تھا - ناگپور کانگریس سے پہلے کانگریس کا ایک اصول تھا جس کے اعتبار سے ھر ایک صوبہ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا خرچ چلانے کے لئے ھر سال ایک رقم دینی پڑتی تھی - بہار کو بھی شاید پندرہ سو (۱۵۰۰) روپے ھر سال دینے پڑتے تھے -

لیکن یہ رقم کبھی پوری ادا نہیں ہوتی تھی - بہت تقاضا ہونے پر بڑے بڑے لوگ سو دو سو روپے چندہ کر کے بھیج دیا کرتے تھے - پھر بھی بڑی رقم ہمیشہ باقی رہتی تھی - کلکتہ سے پٹنہ جانے کے بعد میں صوبائی کانگریس کمیٹی کا وائس پریسیڈنٹ ہوگیا تھا، میں جانتا تھا کہ اس رقم کی ادائیگی میں کتنی دقت ہوتی تھی - دوسری بات جس نے مجھے ڈرا دیا تھا یہ تھی کہ پہلے پہل جب پٹنہ میں کانگریس کا اجلاس سنہ ۱۹۱۲ میں ہوا، تب خرچ کیلئے مجلس استقبالیہ کافی روپیہ جمع نہ کر سکی تھی - مجلس استقبالیہ کے صدر «شری سچدانند سنہا» کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑی تھی - جب ایک باقاعدہ طور سے ودیالیہ کا ماہوار خرچ چلانے کا سوال ہوتا تھا - اس وقت میں گھبراتا تھا - اس کام کو اٹھانا نہیں چاہتا تھا لیکن مہاتما جی کے کہنے پر میں نے فوراً اس کام کو بھی شروع کردیا تھوڑے دنوں کے بعد مہاتما جی کا تار ملا کہ وہ پھر آ رہے ہیں - اس موقع پر ودیاپیٹھ کا افتتاح کیا جائے، روپے کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ اچھی رقم ساتھ لا رہے ہیں، بات یہ

تھی کہ مہاتما جی بنگال سے جھریا آئے تھے وہاں ساٹھ ستر ہزار (۶۰۰۰۰ ۔ ۷۰۰۰۰) کی رقم کوئلے کی کان کے مالکوں نے ان کو دی تھی وہ رقم انہوں نے ودیاپیٹھ چلانے کیلئے ہم کو دے دی ۔ اب رقم مل جانے کے بعد کم از کم کچھ دنوں کیلئے رقم کی طرف سے بے فکر ہوگئے ہم لوگوں نے خوشی خوشی ودیاپیٹھ کو بھی قائم کر دیا ۔ کانگریس کا سالانہ جلسہ دسمبر کے مہینے میں بڑے دن کی تعطیلات میں ہوا کرتا تھا ، سنۂ ۱۹۲۰ کا اجلاس ناگپور میں ہونے والا تھا وہاں بڑے دھوم سے یہ اجلاس ہوا ۔ کانگریس کے اصول کے اعتبار سے نمائندوں کی تعداد پر کوئی روک نہ تھی ، اسلئے جس صوبہ سے جتنے نمائندے بھیجے جا سکے وہ سب شریک ہوئے ۔ عدم تعاون کا پروگرام کلکتہ کے مخصوص اجلاس میں منظور ہو چکا تھا ، لیکن ناگپور میں اس پر دوبارہ بحث ہونے والی تھی ۔ ناگپور کے اجلاس میں میں سمجھتا ہوں نمائندوں کی تعداد اتنی تھی جتنی کسی بھی دوسرے اجلاس میں نہیں ہوئی ۔ کافی بحث کے بعد آخر میں عدم تعاون دوبارہ منظور ہوا ۔ میں سردیوں میں اکثر

بیمار ہو جایا کرتا تھا۔ اس سال بھی گاندھی جی کے ساتھ چند دنوں بہار میں سفر کرنے کے بعد بیمار پڑ گیا۔ اس وجہ سے ناگپور کانگریس میں شریک نہ ہو سکا جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں۔ عدم تعاون پروگرام میں ایک مسئلہ تھا جس کے کافی اختلاف تھا لیکن ایک طرح سے انتخاب ہو جانے کی وجہ سے کم از کم دو سال کے لئے یعنی جب تک دوسرے انتخاب کا زمانہ نہ آئے۔ اب وہ اختلاف زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اسلئے پروگرام کی منظوری میں آسانی ہو گئی تھی۔ کانگریس کے بعد عدم تعاون کا پرچار بہت زور کے ساتھ سارے ملک میں ہونے لگا۔ کانگریس کے لئے جو نیا آئین بنا اس کا اور چرخہ اور کھدر کا پرچار بھی ساتھ ساتھ ہونے لگا۔ بہت سے قومی ادارے کھل گئے، جگہ جگہ درسگاہوں کا افتتاح ہوا. پنچایتیں آپس کے جھگڑوں کا تصفیہ کرنے لگیں، جگہ جگہ شراب بندی کا پرچار بھی ہونے لگا۔ کافی جوش تھا۔ اسکول اور کالج کے طلباء بڑی تعداد میں نکل آئے۔ کچھ تو قومی درسگاہوں میں تعلیم پانے لگے اور بہت سے لوگ پرچار کے کام میں بھی لگ گئے۔ اسی طرح

بہت سے قانون پیشہ لوگ بھی جن میں وکیل، مختار، بیرسٹر سب ھی درجہ کے لوگ تھے اس کام میں مصروف ھوگئے بہار میں جہاں پہلے شاید گنتی کے دو چار آدمی بھی اپنا سارا وقت دے کر ملک کا کام نہیں کر رہے تھے. دفعتاً وھاں ھزاروں آدمی ایسے نکل آئے جو اپنا سارا وقت اس کام میں صرف کرنے لگے - نتیجه یه ھوا که سارے صوبه کے کونے کونے میں کام کرنے والے پہنچ گئے - وہ لوگ عدم تعاون کے پیام کے ساتھ ساتھ سوراج. کھادی اور شراب بندی کا بھی سندیس گاؤں گاؤں پہنچانے - لگے میں سمجھتا ھوں که اس سال شاید ھی کوئی گاؤں ایسا بچا ھوگا. جہاں کانگریس کا «کارکن» نه پہونچا ھو اور جہاں گاندھی جی کا نام اور کانگریس کا پیام نه پہونچا ھو.

میں سارے صوبه کا دورہ کرنے لگا - پہلے تو صرف چند ضلعوں ھی سے تعلق تھا لیکن اس سال سنۂ ۱۹۲۰ میں سارے صوبے کے تقریباً سب ھی «سب ڈویژنوں» میں گیا بہت سے تھانوں میں بھی پہونچا. اکثر گاؤں تو راستے ھی میں آ گئے - اس طرح سارے صوبه سے واقف ھوگیا جہاں

کہیں میں جاتا وہاں بڑے بڑے جلسے ہوتے میں اس سے
پہلے زیادہ تقریریں کرنیکا عادی نہیں تھا، لیکن اس سال اتنی
تقریریں کرنی پڑیں کہ اب زبان کھل گئی تھی۔ گھنٹوں تقریر
کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ اس زمانہ میں دس بیس ہزار
آدمیوں کا جلسہ اکثر ہو جایا کرتا تھا۔ ابھی اس وقت تک
« لاؤڈ اسپیکر » رائج نہیں ہوا تھا۔ اس لئے بڑے بڑے
جلسوں مین اپنی آواز ھی پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ میں پانچ
ھزار تک کے مجمع میں بغیر دقت محسوس کئے ہوئے بول
سکتا تھا۔ دس ھزار سے زیادہ ھونے پر ذرا محنت پڑتی
تھی۔ بیس کے اوپر ہو جانے پر مشکل ہو جاتی تھی اور
آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔ مہاتما جی
علی برادران کے ساتھ سارے ملک کا چکر لگا رہے تھے
بہار سے جانے کے بعد وہ اور اور صوبوں میں بھی سفر
کرتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اڑیسہ پہنچے۔ وہاں
میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے
اجلاس میں شریک ہونے کیلئے « بھوڑہ » چلے گئے۔ میں بھی
ساتھ ھی ساتھ گیا۔ رات میں لوگ چلتی ریل گاڑی کے بھی

درشن کرنے آیا کرتے تھے - جن اسٹیشنوں پر گاڑی نہیں ٹھرتی ان پر بھی ھزاروں کی تعداد میں لوگ درشنوں کے لئے جمع ھوجاتے اور چلتی گاڑی ھی کو دیکھ کر قناعت کر لیتے - دن کو ریلوے لائن کے قریب لوگ کھڑے رہتے اور چلتی گاڑی ھی کو دیکھ کر تسکین حاصل کرلیتے - مجھے یہ سب کچھ دیکھکر تلسی داس جی کا وہ بیان یاد آجاتا تھا جو انہوں نے "شری رام چندر جی" کے بن باس کے متعلق کیا ھے - بجواڑہ میں طے کیا گیا کہ تلک سوراج فنڈ کے لئے ایک کروڑ روپے تیس جون تک جمع کر لئے جائیں - کانگریس کے ممبر اور چرخے بھی کم از کم دس لاکھ کر دئے جائیں .

اپنے صوبہ سے باھر جانے کا یہ میرے لئے پہلا موقع تھا - مہاتما جی بڑے بڑے پبلک جلسوں کے علاوہ مقامی کارکنوں سے جس طرح ملتے اور باتیں کرتے وہ قریب سے اس تحریک میں دوبارہ دیکھنے کو ملا - چمپارن میں ان کے عمل کی طاقت اور محنت کو دیکھ کر ھم حیران رھتے تھے لیکن وھاں کا سارا کام - بغیر کسی پبلک جلسے ھی کے

ہوا تھا اور اب تو کام کرنے والوں سے باتیں بھی ہوتیں۔ تو وہ بھی ایک پبلک جلسے ہی کی شکل اختیار کر لیتیں۔ اِسمیں اور اُسمیں بہت فرق تھا۔ لیکن مہاتما جی کا طریق کار ایک ہی تھا۔ گو اسکی نوعیت بدلی ہوئی تھی۔ وہ برٹش گورنمنٹ کی شکایت زور دار الفاظ میں کیا کرتے تھے، کہیں کہیں اسے شیطانی سلطنت بھی کہا تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے کہیں کہیں رکاوٹ بھی پڑتی تھی۔ بہت سے لوگ گرفتار بھی ہوئے خاص کر شراب بندی کے سلسلے میں۔ لیکن دو باتوں کی بہت تاکید تھی۔ ایک تو یہ کہ اہنسا (عدم تشدد) پر خوب زور دیا جائے تا کہ کہیں بلوہ اور فساد نہ ہونے پائے۔ دوسرے یہ کہ ابھی اپنی طرف سے کوئی قانون توڑنے کا کام نہ کیا جائے۔ لوگ اپنے جوش میں اس بات پر بہت زور دیا کرتے تھے کہ اب قانون توڑنے کا حکم دیا جائے لیکن مہاتما جی ان کو برابر روکے جارہے تھے۔ بھواڑے کے جلسے کے بعد جو پروگرام وہاں مرتب کیا گیا۔ اسکو پورا کرنے میں ہم لوگ مصروف ہوگئے۔ مہاتما جی ابھی ستیہ گرہ کرنی نہیں چاہتے تھے۔

کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ابھی لوگوں میں اگرچہ یہ جوش بہت ہے لیکن پھر بھی انہوں نے ابھی پورا طریقہ نہیں سیکھا ہے۔ ان کو شاید اسکا بھی اندیشہ تھا کہ ستیہ گرہ کی وجہ سے جو سختی ہوگی اسکو عدم تشدد پر رہ کر لوگ برداشت کر سکیں گے یا نہیں۔ اسلئے ابھی وہ روک تھام کرتے تھے۔ دوسری طرف انہوں نے یہ بھی کہدیا تھا کہ ہمارے بنائے ہوئے پروگرام کو لوگ پورا کردیں تو ایک سال کے اندر ہی ہم سوراج لے سکتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں پر اسکا بھی بڑا اثر ہوا۔ شرط کو تو لوگ بھول گئے۔ لیکن ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ع کو اپنے دلوں میں لوگوں نے سوراج کے قیام کے لئے مقرر کردیا۔ میں نے "دیش" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کچھ دن پہلے پٹنہ سے جاری کیا تھا۔ اسکے ایڈیٹر کی جگہ میرا نام چھپتا تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی مضمون لکھ دینے کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ اسمیں کسی نامہ نگار کے بھیجے ہوئے ایک خط یا خبر کی اشاعت ہوگئی جس میں کسی کی شکایت تھی، اسلئے اس نے مجھ پر فوجداری کا مقدمہ چلا دیا۔ مجھے

آرہ کے مجسٹریٹ کی کچہری میں حاضر ہونا پڑا۔ دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ شکایت غلط اور بے بنیاد تھی۔ اسلئے غلطی مان کر معافی مانگ لینے کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن یہ سوال بھی سامنے آیا۔ کہ مجھ جیسے آدمی کے لئے معافی مانگنے کا صاف مطلب یہ لیا جائیگا کہ جیل سے بچنے کے لئے میں نے ایسا کیا۔ اس کا بہت برا اثر دوسرے کام کرنے والوں پر پڑیگا۔ میں اس دبدھا اور مشکل میں پڑگیا کہ اگر میں اپنی غلطی کا اقرار نہیں کرتا ہوں تو یہ جھوٹا طریقہ ہونے کے علاوہ اس آدمی کے ساتھ بڑی بے انصافی بھی ہوگی۔ جسکی غلط شکایت چھپ گئی تھی۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ خواہ کچھ بھی مطلب اسکا نکالا جائے مجھے سچی بات ہی کہنی چاہئے اس ارادے پر پہنچنے میں مظہرالحق صاحب اور بابو برجکشور پرشاد نے میری مدد کی اور میرے دل کو مضبوط بنایا۔ میں گاندھی جی سے سنا کرتا تھا کہ سچائی مین اگرچہ بظاہر وقتی نقصان بھی معلوم ہوتا ہو تو اس سے گھبرانا نہ چاہئے اور اس بات پر بھروسہ رکھنا چاہئے کہ آخر میں اس

سے نفع هی هوگا اور نقصان نه هوگا۔ میں نے معافی مانگ لی اور ساتھ هی یه بھی میں نے کہدیا که سچائی کی بنیاد پر معافی مانگنی چاهتا هوں سزا سے بچنے کے لئے نہیں۔ اسکے بعد مقدمه اٹھا لیا گیا۔ پس یه بات وهیں ختم هوگئی۔ میں نے دیکھا که کام کرنے والوں پر اسکا کوئی برا اثر نہیں پڑا۔ مجھے جو خوف پیدا هوا تھا وه بے بنیاد تھا۔ بھواڑے کا پروگرام ۳۰ جون تک ناقص شکل میں پورا هوا۔ ایک کروڑ سے زیاده روپے جمع هوگئے۔ کانگریس ممبروں کی تعداد بھی کافی هوگئی۔ لیکن چرخوں کا کام ابھی پورا نہیں هوا تھا۔ اور پورا هو بھی نہیں سکتا تھا کیونکه اس چیز کے جاننے والے بہت تھوڑے لوگ تھے۔ اسکا پروگرام بھی ابھی پوری طرح ظاهر نہیں هوا تھا۔ کہیں کہیں جوش میں لوگوں نے چرخے بنائے جو آخر میں کسی کام کے لائق نه نکلے۔ سوت تیار کرایا گیا مگر ان سے کپڑا وغیره بنوانے کا مناسب انتظام نه هونے اور خود سوت بھی بنائی کے قابل نه هونے کی وجه سے بہت برباد هوا۔ مہاتما جی نے اس پر خاص طور سے آرڈر دیا تھا که قومی اسکولوں میں چرخه کو بڑا مقام دیا

جائے انہوں نے تو یہاں تک کہا تھا کہ « ودیاپیٹھوں » کو
بھی چرخے کے ھی مرکز مان کر سارے تعلیمی کاموں کو
سنوارنا چاھئے - چرخے سب ھی قومی اسکولوں میں جاری
تو کئے گئے - لیکن وھاں بھی ان کی صحیح تعلیم نہ ہونے
کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی - یہ پروگرام مردہ ھی سا
رھا - ودیاپیٹھوں کے چلانے والے اکثر تعلیمی طبقہ کے
ایسے ھی لوگ تھے جو کتابی تعلیم کو زیادہ اھمیت دیتے
تھے - چرخہ کے بارے میں نہ تو ان کا یقین تھا اور نہ
انہیں اسکا علم - جہاں کوئی ایسا پڑھانے والا مل گیا جس کو
اسمیں کوئی خاص دلچسپی تھی وھاں پروگرام خوب چلا -
لیکن بیشتر جگہوں پر اگرچہ رھا تو لیکن مردہ ھوکر،
روپے ھاتھ میں آ گئے تو اس وقت اسمیں سے ایک اچھی
رقم لگا کر کہیں کہیں کھادی تیار کرانے کا کام شروع کیا
گیا - ایسی جگہوں پر جہاں لوگ چرخہ کو بھولے نہیں تھے
اسمیں کامیابی بھی ھوئی اور کھادی بننے لگی - بہار میں یہ
کام خوب چلا - مجھے یاد ھے کہ ایک مہین دھوتی جو
مجھے چرخے کے سوت کی بنی بتائی گئی تھی - مہاتما جی

کے سامنے میں نے پیش کی ۔ مولانا محمد علی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے ۔ مہاتما جی بھی بہت خوش تھے ۔ اور اب جب میں سب باتوں پر غور کرتا اور یاد کرتا ہوں کہ اسکے کئی سال بعد اس طرح کا مہین سوت تھوڑی مقدار میں بہار میں تیار ہوتا رہا تو مجھے آج خیال ہوتا ہے کہ ہم یہ بتا کر اس وقت شاید ٹھگے گئے تھے کہ کھادی کا کام اچھا چلنے لگا.

جس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ہی بڑے جوش کے ساتھ عدم تعاون میں شریک تھے ۔ دونوں میں سب ہی کاموں میں ایک طرح کے مقابلے کی رقابت ہوجاتی، سب جگہوں میں کانگریس کے علاوہ خلافت کمیٹیاں قائم ہوگئیں اور جوش کے ساتھ ہندوؤں نے خلافت کمیٹیوں کو منظم کرنے اور چندہ جمع کرنے میں مدد کی ۔ مسلمان تو کانگریس میں ہوتے اور مدد کرتے ہی تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایکا اور اتحاد کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے ۔ بہت سے لوگ ایسا بھی خیال کرتے تھے ۔ بقرعید کا دن ایک ایسا دن ہوتا ہے ۔ جب خاص کر ہند میں گائے کی قربانی کی

وجه سے ھندو اور مسلمانوں میں جھگڑے ھوجایا کرتے ھیں۔ اس سال جب بقرعید کا دن قریب آیا تو سب کو یہ فکر ھوئی کہ اس اتحاد میں کوئی رکاوٹ نہ پڑنے پائے۔ گاندھی جی مولانا محمد علی کے ساتھ پھر دورہ کرنے آئے، کئی دن تک مختلف اضلاع میں پھرتے رھے، سب ھی مقامات پر ان کی مولانا کی تقریریں ھوئیں۔ انہوں نے گائے کی «رکھشا» اور حفاظت مسلمانوں پر چھوڑ دی، مسلمانوں کی طرف سے اعلان نکالے گئے کہ جہاں تک ھوسکے گائے کی قربانی نہ ھونی چاھئے۔ نتیجہ یہ ھوا کہ اس سال بقرعید میں گائے کی قربانی اتنی کم ھوئی کہ اس سے پہلے شاید کبھی نہیں ھوئی تھی۔ اس سے اتحاد اور ایکے پر اور بھی مضبوطی کی مہر لگ گئی لیکن بعد میں ایسا معلوم ھوا کہ یہ اتحاد مستقل نہیں تھا۔ مہاتما جی اور علی برادران کے متحدہ دورے کے ختم ھونے کے پہلے ھی اسکی علامتیں ظاھر ھونے لگی تھیں۔

بہار سے مہاتما جی کلکتہ گئے۔ وھاں سے مدراس کی طرف روانہ ھوئے۔ راستے ھی میں مالا بار کے موپلوں میں

ھلچل کی خبر ملی - مولانا محمد علی گرفتار کر لئے گئے - ھندو مسلمانوں میں اختلاف اور بے اعتمادی کی علامتیں اس موپلہ ھلچل میں دکھائی دینے لگیں - موپلہ لوگ سیدھے لیکن جوشیلے ھوتے ھیں - ان کی بغاوت خلافت کی وجہ سے برٹش سرکار کے خلاف تھی - اسمیں مذھبی جذبہ ھی اھم سبب تھا - مذھبی جذبہ جب ایک بار ابھر جاتا ھے تو اسکی بہت سی شکلیں ھوجاتی ھیں - اس بار مالا بار میں مذھبی جذبہ نے ایک عجیب رنگ دکھایا - موپلوں کا جھگڑا برٹش سرکار کے ساتھ تھا لیکن کچھ ایسے ھندوؤں کے ساتھ جن کے متعلق ان کو شبہ تھا کہ یہ برٹش گورنمنٹ کی مدد کر رھے ھیں، انہوں نے سختی اور زیادتی کی - اسکا اثر دوسرے ھندوؤں پر پڑا - ان موپلوں کا جھگڑا اس طرح سے ھندوؤں کے ساتھ شروع ھوگیا - اسکا نتیجہ بہت برا نکلا، کیوں کہ جو لڑائی برٹش گورنمنٹ سے تھی اسمیں وہ ھندوؤں کو بھی ایک فریق سمجھنے لگے - نتیجہ یہ ھوا کہ اب اسکا اثر ھندوستان کے دوسرے حصوں پر بھی کچھ نہ کچھ پڑا، اگرچہ یہ بات اس وقت اتنی نہیں پھیلی تھی لیکن پھر بھی یہ خبر

زوروں سے پھیلی تو ــ کہ موپلوں نے بہت سے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنا لیا ھے ــ اسلئے سارے ملک میں اشتعال و غصہ پیدا ہوگیا لیکن ابھی گاندھی جی باھر تھے پھر بھی کانگریس اور خلافت کمیٹی کا اتنا زور تھا کہ یہ خیال اور برا جذبہ ٹک نہ سکا بلکہ دور ہوگیا.

علی برادران اور کچھ دوسرے لوگوں پر جن میں شری شنکر اچاری بھی شامل تھے ۔ کراچی میں خلافت کمیٹی کے جلسوں میں حصہ لینے اور تقریر کرنے کے الزام میں مقدمے چلائے گئے ۔ الزام یہ تھا کہ ان لوگوں نے وھاں ایک ایسے فتوے کا پرچار کیا جس پر گورنمنٹ نے پابندی لگا دی تھی کراچی کے مقدمے کی وجہ سے سارے ملک میں بڑی ہلچل تھی ۔ شری شنکر اچاری کے بھی ایک مجرم ہونے کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کو بڑی تائید ملی ۔ لیکن جو پھوٹ اور نفاق کا بیج پڑ گیا تھا وہ وقت پا کر بعد میں اُگ آیا.

ادھر ملک میں سب جگھوں سے اس بات کا مطالبہ ہونے لگا کہ انفرادی ستیہ گرہ شروع کرنی چاھئے ۔ شہزادہ (پرنس آف ویلز) کے ہندوستانی دورے کے دن بھی قریب

آ گئے۔ احمد آباد میں ہونے والی کانگریس کا وقت بھی آ پہنچا۔ مہاتما جی ابھی تک ستیہ گرہ کرنے کے طرف دار نہ تھے۔ اس کے لئے انہوں نے کل شرطیں لگائیں۔ یہ بھی اطلاع دی کہ جب تک یہ کڑی اور سخت شرطیں پوری نہیں ہوں گی وہ ستیہ گرہ کی اجازت نہیں دینگے. ان میں ایک شرط یہ بھی کہ اسی علاقہ میں ستیہ گرہ کی جاسکتی ہے جہاں کھادی کا کافی پرچار ہوچکا ہو۔ تعمیری کام کے جز حسب ہدایت پورے کئے گئے ہوں۔ اب جگہ جگہ ان شرائط کے پورے کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ «بہار» میں ضلع «چھپرا» کے تھانہ «بسنت پور» کے لوگوں نے یہ دعوی پیش کیا کہ وہ شرائط کو پورا کر چکے۔ اس لئے ان کو اب اجازت ملنی چاہئے.

پرنس بمبئی میں اترے وہاں بلوہ ہوگیا۔ اس میں پارسیوں کے ساتھ جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ شہزادے کے استقبال میں شریک ہوتے تھے۔ زیادتیاں کی گئیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ فساد دور تک پھیلے گا جس کی وجہ سے مہاتما جی فکر مند تھے۔ چنانچہ انہوں نے روزہ رکھ

لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں فساد موقوف ہوگیا۔ یہ ایک نیا تجربہ ملک کو ہوا۔ « ورکنگ کمیٹی » کی ایک نشست بمبئی میں ہوئی اسمیں بھی میں شریک تھا۔ اس جلسے میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس سے ہم لوگوں کو مہاتما جی کی بڑائی اور تحمل کی ایک جیتی جاگتی مثال مل گئی۔ بمبئی میں بلوہ کی وجہ سے جو لوگ پہلے ہی سے شہزادے کے بائیکاٹ کے مخالف تھے وہ اور بھی کہنے لگ گئے کہ اس کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا۔ جو ہوا۔ اس سارے پروگرام کی مخالفت میں وہ بہت زور سے بولنے اور لکھنے لگے۔ ایسے لوگوں میں « شریمتی بی سینٹ » بھی تھیں۔ وہ شروع ہی سے اس پروگرام کی مخالفت کرتی چلی آرہی تھیں۔ انہوں نے ایک سخت مضمون اپنے ہفتہ وار پرچہ میں لکھا۔ « دیش بندھو داس » کا خیال ہمیشہ سے « شریمتی بی سینٹ » کے خلاف تھا وہ اس مضمون کو ساتھ لائے مہاتما جی سے انہوں نے « کانگریس ورکنگ کمیٹی » میں کہا کہ میں امید کرتا ہوں کہ آپ « ینگ انڈیا » کی اگلی اشاعت میں اس کا ایک منہ توڑ جواب دیں گے اور ہم لوگ

اسے دیکھ سکیں کے مہاتما جی نے مسکرا کر کہا۔ " کہ آپ ایسی چیز " ینگ انڈیا " میں پانے کی امید نہ رکھیں۔ ینگ انڈیا کا اصول برابر جاری رہا۔ انہوں نے اپنے کسی مخالف کے متعلق کبھی کوئی ایسی بات کبھی نہ لکھی۔ جس میں کڑوا پن ہو یا مخالف مضمون کے بارے میں کسی قسم کے برے جذبے کی گندگی تک بھی ہو۔ اگرچہ دیش بندھو داس نے اپنے طریقہ سے ان دلیلوں کو رد کیا۔

نومبر کا مہینہ آچکا تھا۔ اب لوگوں میں ستیہ گرہ کے لئے جوش اور اضطراب بہت بڑھتا جارہا تھا۔ ستیہ گرہ کے لئے کوئی مخصوص پروگرام بنانے یا اس کو باضابطہ شروع کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ جہاں جہاں شہزادے کو جانا تھا۔ وہاں بائیکاٹ کے متعلق مظاہروں کی وجہ سے گورنمنٹ نے گرفتاریاں شروع کردی تھیں۔ اب کسی مقام پر شہزادے کے پہونچنے کا انتظار گورنمنٹ نہیں کرتی تھی بلکہ اس سے پہلے ہی مظاہرہ روکنے کے لئے گرفتاریاں کرتی تھی لیکن پھر بھی مظاہرے نہ رکتے بلکہ زوروں سے ہوتے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ملک کے سب ھی جلسوں میں والنٹیر جماعت بنانے کی ھدایت دی تھی، سب ھی جگہوں میں والنٹیر بھرتی کئے جا رہے تھے۔ حکومت نے اس جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ والنٹیر بڑی تعداد میں گرفتار ھونے لگے۔ جو لوگ کبھی والنٹیر نہیں بنے تھے وہ لوگ والنٹیر بن کر گرفتار ھونے میں اپنی عزت اور شہرت سمجھنے لگے اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ آپ سے آپ ستیہ گرہ چھڑ گئی اور وہ بھی گورنمنٹ کی وجہ سے۔ لوگوں میں اس قدر جوش پھیلا کہ گورنمنٹ بھی گھبرا گئی وہ اب اس کوشش میں لگ گئی کہ کسی طرح صلح ھو جائے۔ بڑے بڑے نیتا بھی مثلاً دیس بندھو داس، پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ گرفتار ھوچکے تھے پھر بھی جنتا کے جوش میں کمی نہیں آئی۔ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ اس فکر میں تھے کہ شاھزادے کے کلکتہ پہونچنے پر کسی طرح کی گڑ بڑ نہ ھونے پائے اس لئے انہوں صلح کی بات چیت شروع کی۔ دیس بندھو داس کلکتہ ھی کے جیل میں تھے

اسلئے ان سے بات چیت کی گئی۔ وہ کسی حد تک صلح کے لئے تیار بھی ہوگئے لیکن جن شرائط پر وہ صلح کرنا چاہتے تھے مہاتما جی کو ناکافی معلوم ہوئیں اسلئے انہوں نے شرائط کو نامنظور کر دیا۔ آخری بات چیت ابھی پوری ہونے بھی نہ پائی تھی کہ پرنس کلکتہ پہنچ گئے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں زور دار مظاہرہ ہوا جہاں جہاں شاہزادے گئے مظاہرہ ہوتا ہی گیا. تحریک کو دبانے کے لئے پہلے سے کار روائی ہو رہی تھی اس میں لارڈ ریڈنگ نے اور بھی سختی کر دی۔ دیس بندھو داس. مہاتما جی کی اس کار روائی سے بہت غیر مطمئن ہوئے اسلئے جیل سے نکلنے کے بعد انہوں نے اس پر سخت نکتہ چینی بھی کی.

اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی بہار میں ہوا۔ جو لکھنے کے قابل ہے۔ وہاں بھی اور جگہوں کی طرح خوب زور سے گرفتاریاں ہو رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب کے سب گرفتار کر لئے جائیں گے لیکن میں بچ گیا اور میری گرفتاری نہیں ہوئی میں نے سنا کہ غلط فہمی کی وجہ سے میں گرفتار نہیں کیا گیا صرف میں ہی نہیں بچا۔ بلکہ سارے بہار میں

گرفتاریاں بند ہوگئیں۔ وہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ جس وقت دیش بندھو داس کے ساتھ لارڈ ریڈنگ سمجھوتے کی بات چیت کر رہے تھے تو انہوں نے اپنی ایگزیکیٹو کونسل کا اجلاس کلکتہ میں کیا۔ اسکا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ان شرطوں کو باضابطہ منظور کرلیا جائے جن کو دیش بندھو داس نے منظور کرلیا۔ اسوقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب سمجھوتہ ہو ہی جائیگا۔ سر تیج بہادر سپرو وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے۔ اس جلسہ میں شرکت کے لئے وہ کلکتہ آرہے تھے وہ جب پٹنہ ہوکر گذرے تو وہاں پر ان سے۔ بہار کے گورنر سے کچھ بات چیت ہوئی جس سے گورنر کو ایسا محسوس ہوا اور اس نے سمجھ لیا کہ اب صلح ہوگئی۔ اسلئے اس نے گرفتاریاں بند کر دیں صلح تو آخر میں ہوئی نہیں لیکن میں اور بہت سے لوگ جن کی گرفتاری ہونے والی تھی گرفتار نہیں کئے گئے۔

اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد احمدآباد میں کانگریس کا اجلاس بڑی شان کے ساتھ ہوا۔ دیش بندھو داس صدر منتخب ہوئے لیکن چونکہ وہ جیل میں تھے اسلئے حکیم

اجمل خان نے صدارت کے فرائض انجام دیئے ۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ مظاہرہ بھی بڑے جوش کے ساتھ کیا گیا ۔ یہ پہلا موقع تھا جب کانگریس کا اجلاس بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا ۔ اب تک کانگریس میں لوگ کرسیوں اور بنچوں ھی پر بیٹھا کرتے تھے ۔ احمد آباد میں سب سے پہلے فرش پر کانگریس کا اجلاس ھوا ایک بڑے معرکہ کی تجویز جس پر بڑی سرگرمی کے ساتھ بحث ھوئی ۔ مولانا حسرت موھانی کی تھی جس میں انہوں نے برٹش سامراج سے الگ ہو کر ھندوستان کے آزاد ھونے کو کانگریس کا مقصد بنانے جانے پر زور دیا تھا ۔ مہاتما جی نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی تھی ۔ ان کی مخالفت کی وجہ سے وہ تجویز نامنظور ھوگئی تھی —

ایک بڑا واقعہ سبجکٹ کمیٹی میں پیش آیا ۔ وہ بھی لکھنے کے قابل ھے اس سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ مہاتما جی ان لوگوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے تھے جو ستیہ گرہ کا مقصد سمجھے بغیر ھی اس پر چلنا اور دوسروں کو مجبور کرنا چاھتے تھے ایک دوست گنگو رکھشا کے بڑے

پرچار کرنے والے تھے - سبجکٹ کمیٹی کے بیچ میں وہ آ کر بیٹھ گئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ جب تک ان کے لئے گئو رکھشا کے متعلق قابل اطمینان کار روائی نہ کی جائے گی اسوقت تک وہ سبجکٹ کمیٹی کی کار روائی نہیں ہونے دیں گے یوں تو اگر رضا کار چاہتے تو ان کو پکڑ کر آسانی سے باہر لے جاسکتے تھے اور کار روائی بھی کی جاسکتی تھی لیکن مہاتما جی کو یہ طریقہ پسند نہ تھا انہوں نے ایسا نہ کرنے دیا سب لوگوں کو اس بات کی حیرت تھی کہ دیکھیں ایسے ضدی آدمی کے ساتھ بغیر زبردستی کے مہاتما جی کیا برتاؤ کرتے ہیں اور کس طرح کانگریس کے کام میں اس پڑی ہوئی رکاوٹ کو دور کرسکتے ہیں انہوں نے اور دوسرے لوگوں نے بھی گئو رکھشا والے مہاشے کو بہت سمجھایا کہ آپ اس طرح کام میں رکاوٹ نہ ڈالئے لیکن وہ کب کسی کی سننے والے تھے آخر میں مہاتما جی نے ہنستے ہوئے کہا کہ آپ ستیہ گرہ مجھ سے زیادہ نہیں جانتے ہیں اب دیکھئے کہ میں کس طرح آپ کے ہاتھ لگائے بغیر اپنا کام کر لیتا ہوں - اتنا کہہ کر انہوں نے والنٹیروں سے کہا کہ ان کے

چاروں طرف تم لوگ کھڑے ہو جاؤ۔ اس کے بعد اور لوگوں سے کہا ہم لوگ کسی دوسری جگہ پر اپنا کام کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچ ہی میں گھرے پڑے رہے۔ ان کے کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ ادھر کمیٹی نے اپنا کام الگ ہٹ کر جاری رکھا۔

[م جھ زل]